

**THE BOOK WAS
DRENCHED**

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222688

UNIVERSAL
LIBRARY

گلدستہ ادب



مولفہ

پنڈت منوہر لال زتشی ایم۔ اے

آئی۔ ٹی۔ ایس

! ہتمام کالی کے۔ سزا پر نثر و پبلشر

انڈین پریس لمیٹڈ

الہ آباد

2007

2007

گلدستہ ادب

مؤلفہ

پنڈت منوہر لال زنتشی۔ اکیم۔ اے

آئی۔ ٹی۔ ایس

انڈین پریس لمیٹڈ۔ آلہ آباد

۱۹۳۰ء

شکریہ

میں ان سب بزرگوں کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے
 نہایت دریا دلی سے مجھ کو اپنی تمنا یف سے یا ایسی تصانیف سے جو
 اُن کے قبضہ میں تھیں انتخاب کرنے کی اجازت دی۔

حضرت شبلی نعمانی کا میں خصوصاً شکر گزار ہوں۔ جناب مدد میں نے
 نہ صرف اپنی شائع شدہ تصانیف سے انتخاب کرنیکی اجازت دی بلکہ ان کے
 کی چوتھی جلد شائع ہونے کے قبل اسکا پروف مجھ کو بھیج دیا اور اس میں سے
 جو مضامین میں چاہتا تھا اُن کو اخذ کرنیکی اجازت عطا فرمائی۔

منوہر لال زلتی

فہرست مضامین

نشر

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
۱۵۹	رسم و رواج (ماخوذ از تہذیب الاخلاق)	۷	۱	میرامن
۱۶۶	خوشامد	۸	۲	انتخاب از بلاغ و بہار
۱۷۰	سیریزیشن یا تہذیب	۹	۱۸	مرزا حبیب علی بیگ سرور
۱۷۷	اپنی مدد آپ	۱۰	۱۹	لکھنؤ (ماخوذ از فسانہ عجائب)
۱۸۹	شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی	۲۷	۲۷	مرزا اسد اللہ خاں غالب
۱۹۰	شامی (ماخوذ از شعرالجم جلد ۴)	۱۱	۳۰	رغبات غالب
۲۲۰	پینڈت برج نرائن حکیمت	۵۲	۵۲	شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد
	لکھنوی	۵۶	۵۶	زبان اردو کی تاریخ (ماخوذ از آب حیات)
۲۲۲	تاریخ (ماخوذ از رسالہ تہذیب)	۱۲	۸۹	۵ برتج بھاشا عربی و فارسی زبانوں نے
	نظم			کیا کیا اثر کئے۔ (ماخوذ از آب حیات)
۲۲۳	مرزا محمد رفیع سودا	۱۳۸	۱۳۸	نورشاہ کا زمانہ اور نادر شاہ کا آنا
۲۲۶	غزلوں کا انتخاب	۱		(ماخوذ از قصص ہند حصہ دوم)
۲۲۷	مخمس شہر آشوب	۱۵۸		سر سید احمد خاں

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ
۲۸۷	شریشہ آبدار	۱۴	۲۵۱	میر تقی میر
۲۸۸	تلوار کا کاٹ	۱۵	۲۵۳	۴ غزلوں کا انتخاب
۲۸۹	مسافت	۱۶	۲۵۷	خواجہ حیدر علی آتش
۲۹۰	عجز و انکسار	۱۷	۲۵۸	۴ غزلوں کا انتخاب
۲۹۱	اولاد	۱۸		مرزا اسد اللہ خاں غالب
۲۹۳	رباعیات	۱۹	۲۶۵	۵ غزلوں کا انتخاب
۲۹۶	شمس العلماء خواجہ الطامین حالی		۲۶۸	۶ قصائد کا انتخاب
۲۹۷	مرثیہ غالب	۲۰	۲۷۳	۷ آم کی تعریف
۳۰۳	چپ کی داد	۲۱	۲۷۴	۸ غالب اور ذوق کے سہرے
۳۱۳	ڈاکٹر محمد اقبال اکملی		۲۷۷	۹ معذرت از مرزا غالب
۳۱۴	ہمارا دلیس	۲۲	۲۷۸	میر بہر علی انیس
۳۱۵	جگنو	۲۳	۲۸۱	۱۰ مناجات
۳۱۶	نیا شہالہ	۲۴	۲۸۳	۱۱ صبح کی بہار
	پندت برج نرائن حکیمیت		۲۸۵	۱۲ گرنی کی شدت
۳۱۸	غزلوں کا انتخاب	۲۵		
۳۱۹	رامائن کا ایک سین	۲۶	۲۸۶	۱۳ گھوڑے کی تعریف
۳۲۵	دولت	۲۷		

میرامن دہلوی

ان کے بزرگ ہالیوں بادشاہ کے عہد سلطنت مغلیہ کے دامن سے وابستہ۔
 سلطنت مذکور کے زوال کے بعد جب دلی کے گرو نواح میں جاٹوں کا غلبہ ہو گیا
 تو ان کی موروثی جاگس میں ضبط ہو گئیں، اور احمد شاہ ابدالی کے تاخت و تاراج کے
 زمانہ میں ان کا گھر بھی اٹ گیا۔ مجبوراً میرامن نے دہلی چھوڑ کر پورب کاش خاں اور کچھ
 روز نظام آباد رہنے، میں قیام کر کے کلکتہ پہنچے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں کلکتہ
 کے مشہور قلعہ فورٹ ولیم میں سرکار انگریزی کے طرف سے ایک کالج ان انگریزوں کی
 تعلیم کی غرض سے قائم کیا گیا تھا جو ولایت سے الٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہو کر مشہور
 آکارتے تھے۔ سلسلہ میں لاہور و لڑکی نے کل کرائسٹ صاحب کو اس کالج کا
 پرنسپل مقرر کیا صاحب موصوف کو ہندوستانی زبان کی تدوین کا خاص شوق تھا۔
 چنانچہ انھوں نے نہ صرف خود اس زبان کی گرامر اور ڈکشنری تیار کی بلکہ اپنی بیگم کی
 کئی ایک قابل مصنفوں سے ہندی اور اردو نثر میں کتابیں لکھوائیں۔ سید محمد نجف
 حیدری مصنف طوطا کمانی، میر شیر علی افسوس مترجم باغ اردو مصنف آرائش محفل
 منشی کرام علی مترجم اخوان الصفا۔ سری للو لال جی کوئی مصنف پریم ساگر اس
 فورٹ ولیم کی انجمن کے برگزیدہ اراکین ہیں۔ سلسلہ میں میرامن نے اس

بزم سخن میں داخل ہو کر باغ و بہار کے نام سے چار رویش کا قصہ آراستہ کیا۔
 باغ و بہار کی زبان بامعاوردہ صاف اور سلیس ہے اور اس زمانہ کی نشر کی
 تصنیفات میں اس کا رتبہ اعلیٰ ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ
 جس طرح اردو نظم کی پیدائش کا فخر وکن اور اس کی نشوونما اور ترقی کا فخر دلی
 اور لکھنؤ کو حاصل ہے اسی طرح اردو اور ہندی نثر کی تدوین اور ترتیب پر
 ملکایہ اگر چاہے تو ناز کر سکتا ہے کیونکہ اس سے پہلے صرف ایک کتاب وہ
 مجلس حامی محمد شاہ کے عہد میں ایک بزرگ فضلی تخلص نے اردو نثر میں لکھی
 تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب دلی اور لکھنؤ کے اہل قلم اردو لکھنا عار سمجھتے تھے،
 اور علم ادب کی تصانیف تو دور کننا معمولی خط و کتابت بھی اس زبان میں
 نہیں کرتے تھے۔ ہم کو میر امن اور ان کے ہم جلسیوں کا ممنون ہونا چاہئے
 کہ جنہوں نے آج سے سو برس پہلے اردو نثر کی پادشہ اور پردانت کر کے^{۱۸}
 اس میں علمی زبان بننے کی صلاحیت پیدا کی۔

انتخاب ازباغ و بہار

منشا اس تالیف کا یہ ہے کہ سن ایک ہزار دو سو پندرہ برس ہجری
آؤرا محطارہ سو ایک سال عیسوی مطابق ایک ہزار دو سو سات سن فضلی
کے عہد میں اشرف الاشرف مارکونس ولزلی گورنر جنرل لارڈ مارننگٹن صاحب
کہ جن کی تعریف میں عقل حیران اور فہم سرگرداں ہے۔ جتنے وصف مردار و
کو چاہئے اُس ذات میں خدا نے جمع کئے ہیں۔ غرض قسمت کی خوبی
اس ملک کی تھی جو ایسا حاکم تشریف لایا جس کے قدم کے فیض سے
ایک عالم نے آرام پایا۔ مجال نہیں کہ کوئی کسی پر زبردستی کر سکے۔ شیر
اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ سارے غیب اور غرُبا دُعادیتے

ہیں۔ اور جیتے ہیں۔ چرچا عالم کا پھیلا۔ صاحبانِ دیشان کو شوق ہو کارِ دو کی زبان
 سے واقف ہو کر ہندوستانیوں سے گفت و شنود کریں اور ملکی کام کو
 باکا ہی تمام انجام دیں۔ اس واسطے کتنی کتابیں اسی سال موجب
 فرمایش کے تالیف ہوئیں۔ جو صاحبِ دانا اور ہندوستان کی زبان
 بولنے والے ہیں، اُن کی خدمت میں گزارش کرتا ہوں کہ یہ قصہ
 چار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اس تقریب سے کہا
 کہ حضرت نظام الدینؒ اولیا زری زرخیز جو اُن کے پیر تھے اور درگاہ
 اُن کی دلی میں قلعے سے تین کوس لال دروازے کے باہر ٹیا
 دروازے سے آگے لال بنگلے کے پاس ہے۔ اُن کی طبیعت
 ماندی ہوئی تب مُرشد کا دل بہلانے کے واسطے، امیر خسرو قصہ ہمیشہ
 کہتے اور تیمار داری میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز میں شفایابی
 عنایت کی۔ تب اُنہوں نے غسلِ محبت کے دن یہ دُعا دہی
 کہ جو کوئی اس قصہ کو سنے گا خدا کے فضل سے تندرست رہیگا۔
 جب سے یہ قصہ فارسی مرقع ہوا۔ اب صاحبِ ثروت
 ذی شانِ محبتوں کے قدر دان جان گلکرسٹ صاحب نے اس
 بیچہ دان سے ازراہ مہربانی کے فرمایا کہ اس قصہ کو ٹھیکہ ہندوستانی
 گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان عورت مرد لڑکے بالے خاص و عام

آپس بولتے ہیں ترجمہ کرو موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسل
 محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے پہلے اپنا احوال
 یہ عاصی گنہگار میں امن دلی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ بہایوں بادشاہ
 کی عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں اُٹھتے ورنہشت جانفشانی
 بجالاتے رہے اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدر دانی جتنی چاہئے فرما
 رہے۔ جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایت سے سرفراز کر کے الامال
 اور نہال کر دیا اور خانہ زاد موردی و منصب دار قدیمی زبان مبارک سے فرمایا۔
 چنانچہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی کہ سارے گھر
 اس گھر کے سبب آباد تھے۔ یہ نوبت پہنچی کہ ظاہر ہے۔ عیاں راچہ بیان۔
 سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا اور احمد شاہ درانی نے گھر بار تاراج
 کیا۔ ایسی ایسی تباہی کھا کر اُسی شہر سے کہ وطن اور حرم بھگم میرا ہے اور انول
 و نال وہیں گڑا ہے جلا وطن ہوا اور ایسا جہاز کہ جس کا ناخدا بادشاہ متحانات
 ہوا۔ مین کیسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا ڈوبتے کو تنے کا سہارا بہہ بیٹے۔
 کتنے برس بلند عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ بنی کچھ بگڑی وہاں سے بھی پاؤں اُٹھے۔
 روزگار نے موافقت نہ کی۔ عیاں و اطفال کو چھوڑ کر تنہا کشتی پر سوار ہوا۔
 اشرف البلاد کلکتہ میں آب و دانے کے زور سے آپہنچا۔ چند سے
 بیکار می میں گزرے اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلو اکرا اپنے

چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا تب نشی میر بہادر علی کے وسیلے سے حضور تک جان گلکرسٹ صاحب بہادر و ام اقبال کے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جوان مرد کا دامن ہاتھ لگا بے چاہئے کہ وہ کچھ بھلے آدمی نہیں تو یہ بھی خیریت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بٹے پرورش پا کر دعائیں قدر دیاں کو کرتے ہیں خدا قبول کرے۔

حقیقت اردو کی زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چو جکی ہے وہاں کے راجہ پر جا قدیم سے رہتے تھے اور اپنی بھاکھا بولتے تھے۔ برابر برس سے مسلمانوں کا مل ہوا سلطان محمود غزنوی آیا پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے۔ اس بدولت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پانی آخر امیر تیمور نے جن کے گھر نے میں اب تک نام نہاد سلطنت چلا آتا ہے ہندوستان لیا ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا۔ اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا۔ پھر ہمایوں بادشاہ چٹھانوں کے ہاتھ سے حیران ہو کر ولایت گئے آخر وہاں سے آن کر ایہا ندوں کو گوشمالی دی کوئی مفسد باقی نہ رہا کہ فتنہ و فساد برپا کرے۔ جب اکبر شاہ تخت پر بیٹھے

تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدراق اور فیض رسانی
 اس خاندان الٹانی کی سُن کر حضور میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی
 گویائی اور بولی جُدی جُدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین
 سودا سلف سوال و جواب کرتے، ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی۔ جب
 حضرت شاہجہاں صاحب قرانی نے قلعہ مبارک اور جامع مسجد اور شہرِ نلہ
 تعمیر کروایا اور تخت طاؤس میں جواہر چڑوایا اور ذلِ بادل ساخیمہ چوبوں
 پر استادہ کر طنائوں سے کھینچوایا اور نواب علی مردان خان کو لیکر آیا تب
 بادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا اور شہر کو اپنا دار الخلافت بنالیا تب شاہجہاں
 آباؤ مشہور ہوا۔ اگرچہ دلی جُدی ہے وہ پُرانا اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے اور وہاں کے
 بازار کو اُردو محلّے خطاب دیا۔ امیر تیمور کے عہد سے محمد شاہ کی بادشاہت
 بلکہ احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے وقت تک پڑھی پڑھی سلطنت کیساں
 چلی آئی۔ ندان زبان اُردو کی منجھے منجھے ایسی بولی تھی کہ کوشہر کی بولی اُس سے
 ٹکر نہیں کھاتی لیکن منصف قدردان چاہئے جواب تجویز کرے سواب
 خُدا نے بعد مدت کے جان گلکرسٹ صاحب سادانا نکتہ رس پیدا
 کیا۔ کہ جنھوں نے اپنے گویان اور اُگت سے اور تلاش و محنت سے
 قاعدوں کی کتابیں تصنیف کیں اس سبب سے ہندوستان کی زبان
 کا ملکوں میں رواج ہوا اور نئے سرے سے رونق زیادہ ہوئی

نہیں تو اپنی دستار و گرفتار اور رفتار کو کوئی بُرائی نہیں جانتا۔ اگر ایک
 گنوا سے پوچھئے تو شہر والے کو نام رکھتا ہے اور اپنے تئیں سب سے
 بہتر سمجھتا ہے۔ خیر عاتلاں خود میدانہ۔ جب احمد شاہ ابدالی کابل سے
 آیا اور شہر کو لٹوایا۔ شاہ عالم پورب کی طرف تھے کوئی وارث اور مالک
 ملک کا نہ رہا۔ شہر بے سر ہو گیا۔ بیچ ہے بادشاہ کے اقبال سے شہر
 کی رونق تھی یکبارگی تباہی پڑی۔ رئیس وہاں کے ہیں کہیں تم کہیں
 ہو کر جہاں جس کے سینک سامنے وہاں نکل گئے جس ملک میں پہنچے
 وہاں کے آدمیوں کے ساتھ سنگت سے بات چیت میں فرق آیا
 اور بہت ایسے ہیں، دس پانچ برس کو سبب سے دلی میں گئے اور
 رہے۔ دے بھی کہاں تک بول سکیں گے۔ کہیں نہ کہیں چوک
 ہی جائیئے اور جو شخص سب آفتیں سہکروٹی کار و زرا ہو کر رہا اور دس پانچ
 پشتیں اُسی شہر میں رہتے گذریں اور اس نے دربار امراؤں کے اور میلے ٹھیلے
 عرس چھڑیاں سیر تاشا اور کوچہ گردی اُس شہر کی مدت تک کی ہوگی اور وہاں
 سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا اُسکا بولنا البتہ ٹھیک ہے
 یہ عاجز بھی بریک شہر کی سیر کرنا تاشا دکھیتا یہاں پہونچا ہے شہر و قصہ
چار درویش کا۔ اب آغاز قصے کا کرتا ہوں ذرا کان دھ کر سنو اور
 منہ غنی کرو و سیر میں چار درویش کی یوں لکھا ہے اور کہنے والے نے

کہا ہے کہ آگے روم کے ملک میں کوئی شہنشاہ تھا کہ نوشیہ والی
 سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت اُس کی ذات میں تھی۔ نام اُسکا
 آزاد بخت اور شہر قسطنطنیہ کو استنبول کہتے ہیں اُسکا پایہ تخت تھا اُسکے
 وقت میں رعیت آباد خزانہ معمور لشکر مرفہ حال تھا۔ غریب غُربا اُسود والے
 چین سے گدراں کرتے اور خوشی سے رہتے کہ ہر ایک کے گھر میں دن بید
 رات شب برات تھی اور جتنے چور چکار حبیب کنے صُبح خیزے اُٹھائی گیرے
 و غاباز تھے سب کو نیست نابود کر کے نام و نشان اُن کا اپنے ملک بھیا
 نہ رکھا تھا۔ ساری رات دروازے گھروں کے بند نہ ہوتے اور دکانیں
 بازار کی کھلی رہتیں۔ راہی مسافر جنگل میدان میں سونا اُچھالتے چلے جاتے
 کوئی نہ پوچھتا کہ تمہارے منہ میں کس دانت ہیں اور کہاں جاتے ہو۔ اس
 باوشاہ کے عمل میں ہزاروں شہر تھے اور کئی سلطان غلبندی دینے ایسی
 بڑی سلطنت پر ایک ساعت اپنے دل کو خدا کی یاد اور بندگی سے غافل
 نہ کرتا آرام دُنیا کا جو چاہے سب موجود تھا لیکن فرزند کہ جو زندگانی کا پھل
 ہے۔ اسکی قیمت کے باغ میں نہ تھا اس خاطر اکثر فکر مند رہتا۔ اور پانچوں
 وقت کی نماز اپنے کرم سے کتا کر اے اللہ مجھ عاجز کو تو نے اپنی عنایت سے
 سب کچھ دیا۔ لیکن ایک اندھیرے گھر کا دیانہ دیاسی ارمان جی میں باقی ہے کہ میرا
 نام یو اور پانی دیو کوئی نہیں اور تیرے خزانہ غیب میں سب کچھ موجود ہے ایک بیٹا

جیتا جاگتا مجھے دے تو میرا نام اور سلطنت کا نشان قائم رہے۔ اسی امید
 میں بادشاہ کی عمر چالیس برس کی ہو گئی۔ ایک دن شیش محل میں نماز ادا
 کر کے وظیفہ پڑھ رہے تھے یکبارگی آئینہ کی طرف خیال جو کرتے ہیں تو ایک
 سفید بال موٹھوں میں نظر آیا کہ مانند تار قیش کے چمک رہا ہے۔ بادشاہ دیکھ کر
 آبدیدہ ہوئے اور ٹھنڈی سانس بھری پھر دل میں اپنے سوچ کیا کہ افسوس
 تو نے اپنی عمر ناحق برباد کی اور افسوس اس دنیا کی حرص میں ایک عالم کو زیر و زبر
 کیا اتنا ملک جو یا اب تیرے کس کام آوے گا۔ آخر یہ سارا مال و اسباب
 کوئی دوسرا اڑاویگا تجھے تو پیغام موت کا آچکا اگر کوئی دن بھی بنے تو بدن کی
 طاقت کم ہوگی اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میری تقدیر میں نہیں لکھا کہ
 وارث تاج و تخت کا پیدا ہو۔ آخر ایک روز مرنا ہے اور سب کو چھوڑ
 جانا ہے اس سے یہی بہتر ہے کہ میں سے چھوڑ دوں اور باقی زندگی اپنی
 خالق کی یاد میں کالوں۔ یہ بات اپنے دل میں سمجھ کر پائیں باغ میں
 جا کر سب بھائیوں کو جواب دیکر فرمایا کہ کوئی آج سے میرے پاس آئے
 سب دیوان عام میں آیا جایا کریں اور اپنے کام میں مستعد ہیں کیونکہ
 آپ ایک مکان میں جا بیٹھے اور مسئلے بچھا کر عبادت میں مشغول ہوئے
 سوائے رونے اور آہ بھرنے کے کچھ کام نہ تھا۔ اسی طرح بادشاہ آزاد بخت
 کے کئی دن گزرے شام کو روزہ کھولنے کے وقت ایک چھوڑا اور تین گھونٹ

پانی کے پی کر تمام دن رات جا نماز پر پڑے رہتے۔ اس بات کا باہر چرچا پھیلنا اور رفتہ رفتہ تمام ملک میں خبر گئی کہ بادشاہ نے بادشاہت سے ہاتھ کھینچ کر گوشہ نشینی اختیار کی۔ چاروں طرف سے غنیمتوں اور منسکوں نے سراٹھایا اور قدم اپنی حد سے بڑھایا جس نے چاہا ملک دبا لیا اور سرانجام سرکشی کا کیا۔ جہاں کہیں حاکم تھے ان کے حکم میں خلل واقع ہوا ہر ایک صوبہ سے عسکی بدعنوانی کی پہنچی درباری امراء جیتے تھے سب جمع ہوئے اور اصلاح و مصلحت کرنے لگے۔ آخر یہ تجویز ٹھہری کہ نواب وزیر عاقل اور دانا ہے اور بادشاہ کا مقرب اور معتمد ہے اور درجے میں بھی سب سے بڑا ہے۔ اسکی خدمت میں جلیں دیکھیں وہ کیا مناسب جان کر کہتا ہے سب عمدہ امیر وزیر کے پاس آئے اور کہا بادشاہ کی یہ صورت اور ملک کی حقیقت کا یہ چندے اور تغافل ہوا تو اس محنت کا ٹھکانہ لیا ہوا مفت میں جاتا ہے گا۔ پھر ہاتھ آنا بہت مشکل ہے۔ وزیر پُرانا ٹھکانہ پروردہ قدیم ٹھکانہ حلال اور عقلمند نام بھی خردمند اسم بامستی تھا بلکہ اگرچہ بادشاہ نے حضور میں نیکی واسطے منع کیا ہے لیکن تم چلو میں بھی چلتا ہوں۔ خدا کرے جو بادشاہ کی مرضی آوے اور دبر و بلاوے۔ یہ کہہ کر سب کو اپنے ساتھ دیوان عام تک لایا ان کو وہاں چھوڑ کر آپ دیوان خاص میں آیا اور بادشاہ کی خدمت میں کھلا بھیجا کہ یہ پیر غلام حاضر ہے۔ کئی دنوں سے جمال جہاں آ رہا نہیں

دیکھا امیدوار یوں ہے کہ ایک نظر دیکھ کر قدمبوسی کروں تو خاطر جمع ہو۔
یہ عرض وزیر کی بادشاہ نے سنی از بسکہ قدامت اور خیر خواہی اور تیر سیر اور
جاں نثاری اسکی جانتے تھے اور اسکی بات مانتے تھے بعد تامل کے
فرمایا کہ خردمند کو بلالو بارے جب پروانگی ہوئی وزیر حضور میں آیا آداب
بجلا لایا اور دست بستہ کھڑا ہوا دیکھا تو بادشاہ کی عجب صورت بن رہی ہے
کہ زار زار رونے اور دُہلا پے سے آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں اور چہرہ زرد
ہو گیا ہے خردمند کو تاب نہ رہی بے اختیار دوڑ کر قدموں پر جا گر لیا بادشاہ
نے ہاتھ سے سر اُسکا اٹھایا اور فرمایا تو نے مجھے دیکھا خاطر جمع ہوئی اب جاؤ
زیادہ مجھے نہ سناؤ تم سلطنت کرو خردمند سُنکر ڈاڑھ مار کر رویا اور عرض کیا غلام
کو آپ کے قصّہ قی اور سلامتی سے ہمیشہ بادشاہت میسر ہے لیکن جہانیاں
کی یک بیک گوشہ گیری سے تمام ملک میں تہلکہ مچ گیا ہے اور انجام
اسکا اچھا نہیں۔ یہ کیا خیال مزاج مبارک میں آیا اگر اس خانہ زاد موروثی
کو بھی محروم راز کا کیجئے تو بہتر ہے جو کچھ عقل ناقص میں آوے التماس کہ
غلاموں کو جو ایسی سرفرازیاں بخشی ہیں اسی دن کے واسطے کہ بادشاہ عیش
آرام کریں اور نملک پر مددے تدبیر میں ملک کی رہیں۔ خدا خواستہ
جب فکر مزاج عالی کے لاحق ہووے تو بندہ ہائے بادشاہی کس کام آئیں
گے بادشاہ نے کہا سچ کتا ہے لیکن جو میری فکر جی کے اندر ہے سچ بکا ہے

سن اے خردمند میری ساری عمر اسی ملک گیری کے درد میں کٹی اب
یہ سن و سال ہو آگے موت باقی رہی ہے سو اس کا بھی پیغام آیا کہ سیاہ
بال سفید ہو چلے۔ وہ مثل ہے جیسے کسو نے کما ساری رات سوئے اب
صبح کو بھی نہ جاگیں۔ اب تک ایک بیٹا پیدا نہ ہوا جو میری خاطر جمع ہوتی
اس لئے دل سخت اُداس ہوا اور میں سب کچھ چھوڑ بیٹھا جس کا جی چاہتا
ملک لے یا مال مجھے کچھ کام نہیں بلکہ کوئی دن میں یہ ارادہ رکھتا ہوں
کہ سب چھوڑ چھاڑ کر جنگل اور پہاڑوں میں نکل جاؤں اور منہ اپنا کسو کو نہ
دکھاؤں۔ اسی طرح چند روز زندگی بسر کروں۔ اگر کوئی مکان خوش آیا تو
وہاں بیٹھ کر اپنے معبود کی بندگی بجالاؤں گا۔ شاید عاقبت نجر ہو اور دنیا
کو تو خوب دیکھا ہے نہ پایا اتنی بات بول کر اور ایک آہ بھر کر بادشاہ چپ
ہوئے۔ خردمند ان کے باپ کا وزیر تھا۔ جب یہ شاہراہ سے تھے
تب سے محبت رکھتا تھا علاوہ اس کے دانا اور نیک اندیش تھا۔ کہنے
لگا خدا کی درگاہ سے ناامید ہونا ہرگز مناسب نہیں جس نے ہمدرد ہزار
عالم کو ایک حکم سے پیدا کیا تمہیں اولاد دینی اُس کے نزدیک کیا بڑی
بات ہے قبلہ عالم اس تصور باطل کو دل سے دور کریں نہیں تو تمام عالم
درہم برہم ہو جائیگا اور یہ سلطنت کس کس خست اور مشقت سے
تمہارے بزرگوں نے اور تم نے پیدا کی ہے ایک ذرے میں ہاتھ

سے نکل جائے گی اور بے خبری سے ملک دیران ہو جاویگا خدا نخواستہ
 بدنامی حاصل ہوگی اس پر بھی باز پرس روز قیامت کے ہوا چاہے کہ
 تجھے بادشاہ بنا کر اپنے بندوں کو تیرے حوالے کیا تھا تو ہماری رحمت سے
 مایوس ہوا اور رعیت کو پریشان کیا۔ اس سوال کا کیا جواب دو گے۔
 پس عبادت بھی اُس روز کام نہ آوے گی اس واسطے آدمی کا دل خدا
 کا گھر ہے اور بادشاہ فقط عدل کے واسطے پوچھے جاوے گا غلام کی
 بے ادبی محاف ہو گھر سے نکل جانا اور جنگل جنگل پھرنا کام جوگیوں اور فقیروں
 کا ہے نہ کہ بادشاہوں کا۔ تم اپنے طور کا کام کرو خدا کی یاد اور بندگی جنگل اور
 پہاڑوں پر موقوف نہیں آپ نے یہ بیت سُنی ہوئی **شعر**

خدا اس پاس یہ ڈھونڈتے جنگل میں دھنڈھو را شہر میں لڑکا بفل میں

اگر انصافی فرمائیے اور اس فدوی کی عرض قبول کیجئے تو بہتر لوں ہے کہ جہاں
 پناہ بردم اور بہ ساعت دھیان اپنا خدا کی طرف لگا کر دعا مانگا کریں سکی
 درگاہ سے کوئی محروم نہیں رہا دن کو بند و سبت ملک کا اور انصاف عدالت
 غریب غریب کی فرماویں تو بندے خدا کے دامن دولت کے سائے میں امن و
 امان خوش گذران رہیں اور رات کو عبادت کیجئے اور درود پغیر کی روح پاک کو نیاز کر
 درویش گوشہ نشین متوکلوں سے مد لیجئے اور روز رات یتیم پیر عیال داروں
 محتاجوں اور رائے بواؤں کو کر دیجئے ایسے اچھے کاموں اور نیک نیتوں کی

برکت سے خدا چاہتے تو اُمید قوی ہے کہ تمہارے دل کے مطلب اور مقصد سب پورے ہوں اور جس واسطے مزاج عالی مکدر ہو رہا ہے وہ آزدو بر آوے اور خوشی خاطر شریف کو ہو جائے پروردگار کی عنایت پر نظر رکھئے کہ وہ ایک دم میں جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ بارے خردمند وزیر کی ایسی ایسی عرض معروض کرنے سے آزاد بخت کے دل کو ڈھارس نبھی فرمایا اچھا تو جو کتا ہے بھلا یہ بھی کر دیکھیں۔ آگے جو اللہ کی مرضی ہوگی سو ہوگا۔ جب بادشاہ کے دل کو تسلی ہوئی تب وزیر سے پوچھا کہ اور سب امیر دیر کیا کرتے ہیں اور کس طرح ہیں۔ اُس نے عرض کی کہ سب ارکانِ دولت قبلہ عالم کی جان و مال کو دُعا کرتے ہیں آپ کی فکر سے سب حیران و پریشان ہو رہے ہیں جمال مبارک اپنا دکھائیے تو سب کی خلعت ہر و پچنانچہ اس وقت دیوان عام میں حاضر ہیں۔ یہ سن کر بادشاہ نے حکم کیا انشاء اللہ تعالیٰ کل دربار کروں گا۔ سب کو کمد و حاضر ہیں۔ خردمند یہ وعدہ سن کر خوش ہوا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا دی کہ جب تک یہ زمین و آسمان برپا ہیں تمہارا تاج و تخت قائم رہے۔ اور حضور سے رخصت ہو کر ہنسی خوشی باہر نکلا اور یہ خوشخبری امراؤں سے کہی۔ سب امیر ہنسی خوشی سے گھر کو گئے۔ سارے شہر میں آئندہ ہوگئی عیت پر جاگن ہوئے کہ کل بادشاہ دربار عام کرے گا۔ صبح کو سب خانہ زاد

اعلیٰ ادنیٰ اور ارکانِ دولت چھوٹے بڑے اپنے اپنے پائے اور مرتبے پر اکھڑے ہوئے اور منتظر جلوۂ بادشاہی کے تھے جب پہرہاں چڑھایا گیا کہ پردہ اٹھا اور بادشاہ نے برآمد ہو کر تخت مبارک پر جلوس فرمایا بوقتِ سحرا میں شادیاں بجنے لگے سبھوں نے نذر میں مبارکبادی کی گزرائیں اور مُجرے گاہ میں تسلیمات و کورنشات بجالائے موافقِ قدر و منزلت کے ہر ایک کو سرفرازی ہوئی۔ سب کے دل کو خوشی اور چین ہوا جب دوپہر ہوئی، ہر خاست ہو کر اندر محل داخل ہوئے خاصہ نوش جان فرما کر خوابگاہ میں آرام کیا اُس دن سے بادشاہ نے یہی مقرر کیا کہ ہمیشہ صُبح کو دربار کرنا اور تیسرے پہر کتاب کا شغل یا درود و وظیفہ پڑھنا اور خدا کی درگاہ میں توبہ استغفار کر کر اپنے مطلب کی دعا مانگنی۔ ایک روز کتاب میں بھی لکھا دیکھا کہ اگر کسی شخص کو غم یا فدا یا حق ہو کہ اس کا علاج تدبیر سے نہ ہو سکے تو چاہئے کہ تقدیر کے حوالے کرے اور آپ گورستان کی طرف رجوع کرے درودِ طفیل یا غمبیر کی روح کے ان کو بخشے اور اپنے تئیں نیست و نابود سمجھ کر دل کو اس غفلت و نسیاوی سے ہٹا رکھے اور عبرت سے روئے اور خدا کی قدرت کو دیکھے کہ کُنچے سے آگے کیسے کیسے صاحبِ ملک اور خزانہ اس زمین پر پیدا ہوئے۔ لیکن آسمان نے سب کو اپنی گردش میں

لا کر خاک میں ملا دیا یہ کہاوت ہے۔

دوہرہ

چلتی چکی دیکھ کر دیا کبیر روئے دوپاٹن کے بیچ آتا بت بچا نہ کو
 اب خود دیکھئے سوارے ایک مٹی کے ڈھیر کے اُن کا کچھ نشان باقی نہیں
 ہیں اور سب دولت و دنیا کھربار آلِ اولادِ آشنادوست نوکر چاکر ہاتھی
 ٹھوڑے چھوڑ کر ایلے پڑے ہیں یہ سب ان کے کچھ کام نہ آیا بلکہ اب کوئی
 نام بھی نہیں جانتا کہ یہ کون تھے اور قبر کے اندر کا احوال معلوم نہیں
 کہ کیڑے مکوڑے چوٹے سانپ ان کو کھا گئے یا اُن پر کیا بیٹی اور خدا
 سے کیسی بنی۔ یہ باتیں اپنے دل میں سوچ کر ساری دُنیا کو سُننے
 کا کھیل جانے تب اس کے دل کا غنجہ ہمیشہ شگفتہ رہے گا کہ سو حالت
 میں پڑمردہ نہ ہو گا یہ نصیحت جب کتاب میں مطالعہ کی بادشاہ کو خرمزد
 وزیر کا کہنا یاد آیا اور دونوں کو مطابق پایا یہ شوق ہوا کہ اس پر عمل کر وں
 لیکن سوار ہو کر اور بھیڑ بھاڑ لے کر بادشاہوں کی طرح سے جانا اور پھرتا
 مناسب نہیں۔ بہتر یہ ہے لباس بدل کر رات کو اکیلے مقبروں میں
 یا کسی مرد خدا گوشہ نشین کی خدمت میں جایا کروں اور شب بیدار ہوں
 شاید ان مردوں کے وسیلے سے دُنیا کی مُراد اور عافیت کی نجات
 میسر ہو یہ بات دل میں مقرر کر کے ایک روز رات کو موٹے چھوٹے

کپڑے پہن کر گچھ روپے اشرفی لے کر چھپکے قلعے سے باہر نکلے
 اور میدان کی راہ لی جاتے جاتے ایک گورستان میں پہونچے نہایت
 صدق دل سے درود پڑھ رہے تھے اور اُس وقت بادِ تند
 چل رہی تھی بلکہ آندھی کنا چاہئے یکبارگی بادشاہ کو دور سے ایک
 شعلہ سا نظر آیا مانند صبح کے تارے کے روشن ہے دل میں اپنے
 خیال کیا کہ اس آندھی اور اندھیرے میں روشنی خالی حکمت سے
 نہیں یا یہ طلسم ہے کہ اگر بھٹکری اور گندھک کو چراغ میں بتی کے
 آس پاس چھڑک دیجئے تو کیسی ہی ہوا چلے چراغ گل نہ ہو گایا کوئی
 کا چراغ ہے کہ جلتا ہے جو بچھو ہو سو ہو چل کر دیکھنا چاہے۔ شاید اس
 شمع کے نور سے میرے بھی گھر کا چراغ روشن ہو اور دل کی مراد ملے
 یہ نیت کر کے اُس طرف کو چلے جب نزدیک پہونچے دیکھا کہ چار
 فقیر بنو اکفنیاء گٹھے میں ڈالے اور سر زانو پر دھڑے عام پویشی میں خاموش
 بیٹھے ہیں۔ جیسے کوئی مسافر اپنے قوم اور ملک سے بچھڑ کر کیسی اور غلشی کے
 رنج و غم میں گرفتار ہو کر حیران رہ جاتا ہے اسی طرح سے یہ چاروں نقشِ یار
 ہو رہے ہیں اور ایک چراغ پتھر پر دھکا ٹٹا رہا ہے ہرگز ہوا اس کو نہیں
 لگتی گویا فانوس اس کی آسمان بنا ہے کہ بے خطر جلتا ہے آزارِ بخت
 کو دیکھتے ہی یقین آیا کہ مقرر تیری آرزو ان مردانِ خدا کے قدم کی برکت

سے برآوے گی اور تیری اُمید کا سوکھا درخت ان کی توجہ سے ہر لمحوں پہلے گا۔ ان کی خدمت میں چل کر اپنا احوال کہہ اور مجلس کا شریک ہو شاید تجھ پر رحم کھا کر دُعا کریں جو بے نیاز کے یہاں قبول ہو یہ ارادہ کر کر چاہا کہ قدم آگے دھرے وہیں عقل نے سمجھایا کہ اے بیوقوف جلدی نہ کر ذرا دیکھ لے تجھے کیا معلوم ہے کہ یہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں اور کہ صر جاتے ہیں کیا جانے یہ دیو ہیں یا غول یا باقی ہیں کہ آدمی کی صورت بن کر باہم مل بیٹھے ہیں بہر صورت جلدی کرنا اور اُن کے درمیان جا کر مغل ہونا خوب نہیں ابھی ایک گوشہ میں چھپ کر حقیقت ان درویشوں کی جاننا چاہئے۔ آخر بادشاہ نے یہی کیا کہ ایک کونہ میں اُس مکان کے چپکا جا بیٹھا کہ سو کو اُس کے آنکی اہست کی خبر نہ ہوئی لہذا دھیان ان کی طرف لگایا کہ دیکھتے آپس میں کیا بات چیت کرتے ہیں اتفاقاً ایک فقیر کو چھینک آئی شکر خدا کا کیا وہ تینوں قلندر اُس کی آواز سے چونک پڑے چراغ کو اُسکا یا ٹھیک تو روشنی بھٹی اپنے اپنے بستروں پر حقے بھر کر پینے لگے ایک اُن آوازوں میں سے بولا کہ یاران جہر دوز رفیقانِ بہاں گرد ہم چار صورتیں آسمان کی گردش سے اور لیل و نہار کے انقلاب سے در بدر خاکِ سبر لکیتے تھے پھر اللہ کے طالع کی مدد اور قسمت کی یاوری سے آج اس مقام پر باہم ملاقات

ہوئی اور کل کا احوال کچھ معلوم نہیں کیا پیش آوے۔ ایک سنگ میں
 یا جُدا جُدا ہو جاویں رات بڑی پہاڑ ہوتی ہے ابھی سے پڑ رہنا خوب
 نہیں اس سے یہ بہتر ہے کہ اپنی اپنی سرگزشت جو اس دُنیا میں
 جس پر میتی ہو بشرطیکہ جھوٹ اُس میں کوڑی بھرنہ ہو بیان کرے
 تو باتوں میں رات کٹ جائے جب تھوڑی شب باقی رہے تب لوٹ
 پوٹ رہیں گے سبھوں نے کہا یا ہادی جو کچھ ارشاد ہوتا ہے ہم نے
 قبول کیا۔ پہلے آپ ہی اپنا احوال جو دیکھا ہے شروع کیجئے تو ہم بھی
 مستفید ہوں۔

مرزا جب علی بیگ سرور

مرزا جب علی بیگ سرور لکھنؤ میں پیدا ہوئے آپ صاحبِ دیوان تھے
 اور شاعر ہی میں۔ آغا خانِ رشید حسین خاں نوازش کے شاگرد تھے لیکن ان کی
 شہرت زیادہ تر ان کی نثر نگاری کی بنا پر ہے۔ علاوہ فسانہ عجائب کے
 جو اپنے خاص رنگ میں ان کی بہترین تصنیف ہے۔ نگو فوجت اور
 گلزار سرور۔ دو اور قصے ان سے یادگار ہیں۔ سرور سلطان تربہ شہرِ غازی
 بھی انھیں کی تصانیف ہے تذکرہ ڈوئی تاسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۸۷ھ
 تک لکھنؤ میں رہے ایک اور تذکرہ سے معلوم ہوا کہ ۱۲۸۷ھ میں کلکتہ

گئے تھے وہاں سے واپس آکر پتھر سے ہی دونوں لکھنؤ میں منتقل کیا۔ فسادِ سماج
 نشر کی اُس طرزِ تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہے جس کی بنا قطع اور بناوٹ پر ہے اور
 جلی دلاویزی کا مرامِ مصنوعی حسن پر ہے ایک زمانہ میں اردو کے انشا پردازوں
 میں یہ طرزِ نہایت مقبول تھا مگر اب کچھ تو غالب اور آزاد کی تقلید اور کچھ
 انگریزی تہذیب کے اثر سے لوگوں نے اس کو ترک کر دیا ہے تاہم فسادِ سماج
 کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کا انشا پرداز اس رنگ میں
 بھی کیا کیا رنگینیاں پیدا کر سکتا ہے گو اسی کے ساتھ یہ بات بھی اچھی طے
 ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس طرز کا میدان کس قدر تنگ ہے اور زمانہ حال کی
 دوا دوش کے لئے کس قدر ناقابل ہے۔

لکھنؤ

ماخوذ از فسادِ عجائب

یہ پنبہ دہان بیچیدان محرومِ داستان مقلدِ گندِ شتکان جب علی بیگ سردار
 متوطنِ خطہ بے نظیرِ لپیذِ رشک جنابِ مسکنِ حوِ غلماں جائے مردم
 نیزِ باشندہ یہاں کے ذکی فہیمِ عقل کے تیز اگر دیدہ انصاف و نظرِ غور سے
 اس شہر کو دیکھئے تو جہان کی دید کی حسرت نہ رہے آنکھ بند کر لے شعہ
 سناضواں بھی جبر کا خوشہ چس ہے وہ بیشک لکھنؤ کی سرزمین ہے

بجان اللہ و بجدہ عجب شہر گلزار ہے ہر گلی کوچہ دلچسپ باغ و بہار ہے
 ہر شخص اپنے طور پر قطعدار ہے دور وہ بازار کس انداز کا ہے ہر دکان میں مآ
 ناز و نیاز کا ہے ہر چند ہر محلے میں جہاں کا ساز و سامان مہیا ہے پر اکبری درواز
 سے جلو خانے اور کچے پل تک کہ صراط مستقیم ہے کیا جلسہ ہے نان بابی
 خوش سایقہ شیر مال کباب نان نہاری جہاں کی نعمت اس آبداری کی
 جس کی بوباس سے دل طاقت پائے دماغ معطر ہو جائے فرشتہ گذارے
 تو سو گئے کیسا ہی سیر ہو ذرہ نہ دیر ہو دیکھے سے جھوک لگ آئے وہ مرغ
 شیر خویاز سے نہاری کا گھٹا سر پہلی جھٹکا شیر مال شگفت کی گاس کی خستہ بھینجی
 ایک بار کھانے نان نعمت کا مزہ پائے تمام عمر ہو نہ پائے سادہ جانے
 کباب اس آب و تاب کے کہ مرغ ماہی کا دل چاہے آہ پر دست نہروی
 سے کباب اور ک کالچہ میاں خیر اللہ کی دکان کا اکثر باضم بار یک نایا
 حیمنی کے علو اسوہن پر عجیب جوین اُس کی شیرینی کی گفتگو میں لب
 بند جہان کو پسند پڑے دبیر بے بسائے ہو فٹ سے کھانے و انت
 کا تمام عمر اُس پر دانت رہے لگانے کی نوبت نہ آئے جوری خوب
 حبشی اہل ہند کو مرغوب دودھیا شیر خوارہ نوش کر جاتے ہر کھنڈن
 کی وہ تیکھی چٹوان آدمی صورت دیکھتا رہے رعب حسن سے بات
 نہ کر سکے پر نیا دم و تمامت رشک شمشاد دکانوں میں انواع اقسام کے

میوے قرینے سے چُنے روزِ قرے محاورے اُن کے دیکھنے نہ سنے کبھی
 کوئی پکار اُٹھی میاں ٹلے کہ ڈھیر لگا دیا ہے کوئی موزوں طبیعت یہ فقرہ
 سناتی مزہ انور کا ہے رنگتوں میں کسی طرف یہ صدا آتی گنڈیریا پونڈے
 کی ایک طرف تبولی سرخروئی سے یہ رمز و کتنا یہ کرتے بولی ٹھولی میں
 چپا جا کر ہر دم یہ دم بھرتے مکھئی کا منہ کالا سو باگرد کر ڈالا عبیر ہے نہ
 کلال ہے کتھے چوٹے سے ادھی میں مکھڑالال ہے کلیوں میں گجروم
 یہ آواز آتی شیر مال ہے گھی اور دودھ کی مغلّس کا دل اُچاٹ ہے
 ٹکوں کی چاٹ ہے کدھر لینے والے ہیں نمش کی قفلیاں کھیر کے
 پیالے ہیں کیا خوب بننے بھر بھرے ہیں پتنے پر تل اور مر مرے ہیں
 جیٹھ میاں کئی گکری جس میں پیل انڈا چھوڑتی دو پیسے کو برف کی قفلی
 جمی دو کھائے بدن تھرائے زیادہ ہو کا کرے لقوے فلاح میں مرے
 ہر چوک جہیشہ شانے سے شانا چھلانا سیم صبا کو سیدھا راستہ نہ بلا شیخ کو لی
 کی مٹھانی جس نے کھائی جہان کی شیرینی سے دل کھٹا ہوا بنارس کا
 کھجلا بھولا مٹھرا کے پیڑے کا ٹھٹھا ہوا برنی کی نفاس ت بو باس
 در در اپن اُقرئی ورق کا جو بن کسی اور شہر کا رہا اگر دیکھ پائے یا
 ذائقہ لب پر آئے زندگی تلخ ہو ہاتھ کاٹ کر کاٹ کر کھا امرتی مسلسل کا
 ہریچ ذائقہ کو چچتا ب دیتا یا قوی مفرح کا مزاجب منہ میں رکھا اہل

تو یہ ہے غسل مصفیٰ جنت کی نہد کا حلق سے اُترا بالائی جس دکان پر
 نظر آئی بے قند و شکر شکر کر کر چھری سے کاٹ کر کھائی مارے حقے
 وہ ایجاد ہوئے لکڑی ایسے استاد ہوئے کہ جب تڑا قان کا سنبہ چوان
 کا دم بند ہوا۔ برسات کے موسم میں شہر کا یہ عالم ہے ادھرینہ برسا پانی
 جا بجا بگیا گلی کو چہ صاف رہ گیا ساون بھادوں میں زر دوزی جوتا
 پہن کر پھرے کیچڑ تو کیا مٹی نہ بھرے باغ بہار کی صنعت پروردگار
 کی رضوان جن کا شائق دیکھنے کے لائق روز عیش باغ میں تاشے
 کا میلہ ہر وقت چین کا جلسہ موتی جھیل کا پانی چشمہ زندگانی کی آب و
 تاب دکھاتا پیاسوں کا دل لہتا ترک کے درختوں کی فضا جہٹھا کھچوا
 موجیں مارتا ہار سنگار کے جنگل میں لوگوں کا جم گشتا باغ میں کوئل
 پیسے مور کا شور جھولے پر کشاری اور بھی گنگمور ساون بھادوں
 کے بھالے وہ رنگین جھولنے والے دشت غربت میں یہ جلسہ جو
 یاد آ جاتا ہے دل پاش پاش ہوتا ہے۔ کلیچہ منہ کو آتا ہے۔ نہ کہ کا پور
 کی برسات ہیسات ہیسات دخل کیا دروازے سے باہر قدم دھرے
 اور پھیل نہ پڑے گلی میں پاؤں لکھا کیچڑ کا چھپکا سر پہ پونچا دواس فصل
 میں باہم نہ دیکھے مگر چھلے کے پھننے اور جھنیں سواری کا مقدور سنیر دخل

کیا جو وہ جائیں کہیں اُن کے حق میں برسات حوالات گھر چلتا نہ
 کہیں جاننا نہ آنا اگر خواب میں کہیں نکل گئے تو چونک پڑے کہ پھیل گئے
 اور جو بازاری کارباری ہیں اُن کا یہ نقشہ دیکھا ہاتھ میں جوتیاں بایٹھا
 چڑھا کیچڑ میں لت پت یہاں گرے وہاں گرے خدا خدا کر جیتے گھر پھرے
 اور جو شیخی کے مارے ننگے پاؤں نہ نکلے تو شعر

دیکھی ہے یہ رسم اس نگر میں جوتا ہے کلی میں آپ گھر میں

پھر برسرِ مطلب آیا خاص بازار شہر وسیع و خوش قطع ہے اُس کے
 نقشے سے مانی و بہزاد نے خار کھایا ہے شبیہ کشی تو کیا خاک کا کھینچا
 ہاتھ تھرایا ہے کہ ٹھیاں فرح بخش و دلکش اُرج ہر ایک جہاں نسا
 سلطان منزل اور استری سخن نشاط افزا تو بشکمن انسان کو دیکھ کر سکتا
 ہو جائے کام اُن کا وہم و قیاس میں نہ آئے سر راہ کی بارہ درمی جواہر
 سے جڑی پری کی صبرت کی قریب نہر جاری تکلف کی تیاری پائیں
 باغ اُس کا جس نے دیکھا باغ ارم سمجھا سوسن منظر ہزار باتیں بہم نہیں
 تعریف نہ کر سکا گو نگے کا سپنا ہوا رومی دروازہ اس رفعت و شان
 کا ہے گزر گاہ ایک جہاں کا ہے اگر اُس پر چڑھ جائے بامِ فلک پست
 معلوم ہو فرشتوں کا مشورہ کان میں آئے سپر اولین اُسکی زمین ہے
 شش جہت میں دوسرا نہیں ہے مسجد انتخاب ہے امام باڑہ لا جواب ہے

مقبّرے عالیشان وہ اور مکان کہ فلک بدیدہ انجم نگراں ہے اُن کی نظیر
 کی جستجو میں مشعل مہ و خورشید روز و شب روشن کئے کو بکو سرگرداں ہے
 اگر پاؤں پھیلائے کی جگہ اُن میں ہاتھ آئے سر درست جانے کو جی
 چاہے گو متقی کے انداز سے نہر کی کیفیت نظر آتی ہے طبیعت لہ آتی ہے
 دور رویہ آبادی عمارت کہیں رہنے کسی جا باغ بنے صبح و شام وہ بہار
 نظر آتی ہے کہ شام اودھ اور بنارس کی سحر بھول جاتی ہے شہر نفیس
 نبعہ رئیس ہر فن کا کامل یہاں حاصل ہے خوشنویس حافظ ابراہیم صفا
 سا اس قطع کا قطعہ لکھا جو میر علی یا غنا جیتے ہوتے اپنے لکھے کو روتے
 اشک حسرت سے وصلیاں دھوتے مرزائی صاحب کا یہ حال تھا
 کوئی پرچہ ان کا اُن کی نظر پڑ جاتا بزیہ بزیہ بزیہ کتایا قوت رقم میرا
 لکھاتا مرثیہ خواں میر علی صاحب نے وہ طرز نو مرثیہ خوانی کا ایجاد
 کیا کہ چرخ کہن نے مسلم الثبوت استاد کیا علم موسیقی میں یہ کمال
 بہم پہونچایا اس طرح کا دھڑپت خیال ٹپہ گایا اور بنایا کہ کبھی کسی کے
 وہم و خیال میں نہ آیا تھا ایک رنگیں احاطہ کھینچا ہے جو اُس میں
 آیا پھولا پھولا وہ اُن کا پیرو ہوا اور جس نے ڈھنگ خدا کیا وہ ٹکسال
 باہر ہر رنگ ہوا اگر تانیں جیتا ہوتا ان کے نام پر کان پکڑتا بھیک
 مانگ کھاتا مگر نہ گاتا میزوں میں حسین علی خاں بلبل ہزار داستان

خوش الحال مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر صاف باطن نیک ضمیر خلیق
 فصیح مرد مسکین مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا اللہ کے کرم سے
 ناظم خوب دبیر مرغوب سکندر طالع بصورت گدا بار احسان اہل ذول
 کا: اٹھایا عمدہ قلیل میں مرثیہ سلام دیوان کثیر فرمایا۔ طیب ہر ایک
 سیحائی کرتا ہے تم ہاذنی کا دم بھرتا ہے جسے دیکھا بقراط سقراط جالینوس
 زماں ہے اس معنی میں یہ خط رشک زمیں یونان ہے۔ یہ کہ جان صفا
 پیر نے کے فن سے ایسے آشنا ہوئے کہ مردم بد و نیک سرگرم ثنا ہوئے
 شاعر زبان داں ایسے کہ عرفی اور خاقانی کی غلطی بتائی فردوسی والوری
 کی یاد بھلائی شیخ امام بخش ناسخ نے یہ ہندی کی چندی کی اور روزمرہ
 کو ایسا فصیح و بلیغ کیا کہ کلام سابقین مسوخ ہوا فصحاے شیراز و اصفہان
 اس سیف زبان کا لوہا مان گئے اپنے قبح پر منفعل ہوئے اس زبان کا
 سن جان گئے زمین شہر کو آسمان پر پہونچا یا سیکڑوں کو استاد بنایا خواجہ
 حیدر علی کی آتش بیانی شر افشانی سے دل جلوں کے سینہ میں
 سوز و گداز ہے مرد قانع شاعر ممتاز ہے۔ فرنگی محل کا حال کیا لکھوں
 کہاں زبان و دست کا یار اجوشمہ لکھتا مولوی فاضل عدیم المثال ہے
 شخص جمع علوم کا استاد کتب درسی ابتدا سے انتہا تک یاد منقول و
 معقول میں دقیقہ باقی نہ رہا ریاضی کے ریاض سے آسمان کو زمین

کر دیا مولوی انوار کا پر توفیض جہاں میں روشن مولوی مبین دور بین
 سراج انجمن مولوی تلمور اللہ سبحان اللہ ایسے تحقیق کہاں ہوتے ہیں یہی
 لوگ نادرا الزماں ہوتے ہیں اُدھر رکن دین بلا کد میر سید محمد تہمد مرزا
 کاظم علی متقی آخون محمد رضا رضائے خدا کا جو یا حامل قرآن ہمہ دال کسی
 علم میں عاری نہیں روئے زمین پر آقا تہ تبریزی ساقاری نہیں
 مشائخ فقیروں کے مظلوم خوب خواب راحت میں آسودہ سالک و مجذوب
 شاہ مینا شاہ پیر محمد شاہ خیر اللہ ایک سے ایک سبحان اللہ بظاہر و حقیقت
 میں جیتے ہیں اشیاء لطیف کھاتے پیتے ہیں مولوی عبدالرحمن بگزین
 یزدان عالم باعمل درویش کامل خواجہ باسط اور میر نصیر جن کا عیال نہ
 نظیر خواجہ حسین و حسن سرکردہ انجمن طبیعت بسکد مصروف باختصار
 ہے ایک ایک فقرہ لکھا ہے وگرنہ ان بزرگوں کی صفت میں
 کتابیں تحریر کرے تو بجابت مگر شعور
 کار دنیا کے تمام نہ کر دے ہرچہ گیسرید ختم گیسرید

میرزا اسد اللہ خاں غالب

پیدائش آگرہ ۱۱۹۶ھ وفات دہلی ۱۲۶۹ھ

میرزا غالب کے آبا و اجداد ایک قوم کے ترک تھے۔ ان کے دادا شاہ عالم کے زمانہ میں دہلی آئے اور شاہی دربار میں ملازم ہو گئے جس وقت مرزا کی عمر پانچ برس کی تھی اس وقت ان کے والد الوریس کی لڑائی میں مارے گئے۔ ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کے صوبہ دار تھے۔ انھوں نے مرزا کو باپ کے مرنے کے بعد پرورش کیا۔ چچا کے مرنے کے بعد مرزا انگریزی سے کچھ پیش رفت کر چکی تھی شادی ہونے کے بعد مرزا غالب نے آگرہ چھوڑ کر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور یہیں ۷۲ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ مولوی محمد حسین آزاد نے تاریخ لکھی۔ آہ غالب ببرد۔ مرزا کو فارغ البالی کبھی اٹھیب نہ ہوئی۔ ساری عمر تنگدستی اور غلوک العالی میں گزری چنانچہ ایک دوست کو جس نے نظام دکن کے لئے قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی تھی، لکھتے ہیں۔ ۵ برس کا تھا کہ میرزا باپ مرا۔ ۹ برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میں میرے اور میرے شرکا، حقیقی کے واسطے شامل

جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپیہ سال مقرّر ہوئے۔ اُنھوں نے نہ دئے مگر تین ہزار روپیہ سال۔ ان میں سے خاص میری ذات کا حصّہ ساڑھے سات روپیہ سال فقط۔ میں نے سرکار انگریزی میں غبن ظاہر کیا۔ کولبروک صاحب بہادر رزیڈنٹ دہلی اور اسٹرنلک بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ رزیڈنٹ معزول ہو گئے۔ سکرتر گورنمنٹ برگ ناکاہ مر گئے۔ بعد ایک زمانہ کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرّر کیا۔ ان کے ولیعہد اس تقرّر کے دو برس بعد مر گئے واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے صلہ مع گنتری سو روپیہ سال مقرّر ہوئے وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ چلے یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی دو چلی اس میں ہوئی۔ دہلی کی سلطنت کچھ سخت جاں بحق ہے برس مچھکوروٹی دیکر بگڑی۔ ایسے طالع مرنی کش اور محسن سوز کماں پیدا ہوتے ہیں۔ مرزا غالب فارسی کی نظم و نثر کے سلم الثبوت استاد ہیں فارسی زبان سے ان کو قدرتی لگاؤ ہے اچانچہ خود ان کا قول ہے کہ فارسی سے مجھے مناسبت ازلی ہے یہی وجہ ہے کہ اردو میں اکثر فارسی کے الفاظ اس طرح ترکیب دیجاتے ہیں جو اردو والوں کو بغیر انوس اور غیر سلیس معلوم ہوتے ہیں۔ مزید براں یہ کہ معنی آفرینی اور

نازک خیالی اُن کی شکل پسند طبیعت کا خاص جوہر تھلاسی وجہ سے
 اُن کا شروع کا اُردو کا کلام جو بیدل کے رنگ میں ہے نہایت پیچیدہ
 اور مشکل ہے۔ خواجہ حالی اس زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے یادگار غالب میں
 فرماتے ہیں کہ ”خود مرزا کی زبانی سنا گیا ہے کہ میر تقی نے جو مرزا کے
 ہموطن تھے ان کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ اگر اس لڑکے کو
 کوئی کامل اُستاد مل گیا اور اُس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال
 دیا تو لا جواب شاعر بن جائے گا ورنہ ہمل بکنے لگے گا۔“ لیکن کچھ تو خود
 اپنی طبع سلیم کے تقاضے اور کچھ دوستوں کی روک ٹوک سے مرزا نے
 اپنے اُردو کلام میں سے دو ثلث کے قریب نکال ڈالا اور اس کے
 بعد اس روش پر چلنا چھوڑ دیا۔ مرزا کے اس آخری انداز کلام میں فصاحت
 اور بلاغت کی خوبیاں اس شان سے فراہم ہوئی ہیں کہ کمال سخن
 کی مثال اس سے بہتر ذہن میں نہیں آسکتی۔ جب یہ صاحب کمال
 فاعلیت کو چھوڑ کر سہل متنع پر آجاتا ہے تو روانی اور سلاست کے دریا
 بہا دیتا ہے۔ اور تصوف کی چاشنی تو جس قدر مرزا غالب کے مغرور دیوان
 میں ہے اُس سے زیادہ کسی اُردو شاعر کے یہاں نہیں۔

مرزا کے کمال کی ایک تخصیص اور ہے جو اُردو کے کسی اور

صاحب کمال کو نصیب نہیں۔ وہ یہ کہ جس طرح ان کا پایہ نظم میں عالی

ہے اسی طرح یہ اردو نثر میں طرزِ نوی کی موجد ہیں، اور طرہ یہ کہ انہوں نے نثر میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔ اردو سے معلیٰ محض خطوں اور رتوں کا مجموعہ ہے جس کو لوگ عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں، مرزا نے القابِ آداب کا پڑانا اور فرسودہ طریقہِ قطعی اثرِ زیادہ خط کے شروع میں کبھی میاں کبھی بنخورد کبھی بھائی صاحب کبھی مہاراج، یا اور کوئی مناسب لفظ لکھ دیتے ہیں اور بس۔ اداے مطلب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور شوخی تحریر ان سب پر طرہ ہے بقول خواجہ حالی ”اگرچہ مرزا کے بعد نثرِ اردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے علمی اخلاقی پلائیوکلر سیرشل اور ملیجس مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دئے ہیں بایں گرائی اور ٹودلی میں بھی متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں باوجود اس کے مرزا کی تحریر خطا کتابت کے محدود دائرے میں بلحاظ ملیجی اور لطف بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی۔“

رقعاتِ غالب

منشی ہرگوپال تفتہ کے نام

صاحب تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقعہ ہوا وہ ایک

جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں
 تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے شعر کے دیوان جمع کئے۔ اسی
 زمانہ میں ایک بزرگ تھے کہ ہمارے تمہارے دوست دلی تھے اور
 منشی نبی بخش اُن کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ شخص
 نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دو ملجنم ہم
 کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی ایک خط
 میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا اُس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط
 تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا اور میں
 جس شہر میں اُس کا نام دلی اور اُس محلہ کا نام پتیاروں کا محلہ ہے لیکن
 ایک دوست اُس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ و تعالیٰ
 کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امید کیا غیب کیا اہل حرفہ اگر کچھ
 ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔ اب پوچھو کہ تو کوئی نوکر
 مسکن قدیم میں بیٹھا رہا۔ صاحب بندہ میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم
 کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب
 کیا بلکہ دیوار بدیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجہ زندر سنگھ
 بہادر والے پٹیلہ کے۔ راجہ نے صاحبان عالیشان سے عمدے لیا تھا
 کہ بروقت غارت دلی یہ لوگ بچ رہیں چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی

یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں مبالغہ
 نہ جاننا۔ امیر و غریب سب نکل گئے بہو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیر دار۔
 پشندار و ولتمند۔ اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا
 ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس دار و گیر میں مبتلا ہیں
 گروہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے اور ہنگامے میں شریک ہو رہے
 ہیں۔ میں غریب شاعر و سب سے تاریخ لکھنے اور شہر کے اصلاح
 دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہی اس کو نوکری سمجھو۔ خواہی مزدوری جانو۔
 اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ دفن اشعار
 کی خدمت بجا لاتا رہا اور نظریاتی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا میرا
 شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے
 یا خبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی، لہذا اطلبی نہیں ہوئی
 ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیر دار بلانے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے
 ہیں میری کیا حقیقت تھی۔ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازہ
 سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے، رہا
 یہ کہ کوئی میرے پاس آوے شہر میں ہے کون جو آوے گھر کے گھر
 بے چرخ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بددلت
 یا زود ہم مٹی سے آج تک یعنی شبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔

کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو
توجہ بھی نہیں دیکھنے انجام کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں یاہر سے اندر کوئی بغیر
ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا
چاہئے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔ بہر حال منشی صاحب
کو میرا سلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا اس وقت تمہارا خط پہنچا اور اُسی
وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارہ کو دیا۔

ایضاً

کیوں صاحب روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی، اور اگر کسی طرح
نہیں سنتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے
بھروسے جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔
خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا کہ جو اطراف و جوانب سے دوچار
خط نہ آ رہتے ہوں۔ بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ
خط لاتا ہے ایک دو صبح کو اور ایک دو شام کو میری دلگی ہو جاتی ہے۔ دن
اُن کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے یہ کیا سبب دس دس
بارہ بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا۔ یعنی تم نہیں آئے
خط لکھو۔ صاحب نہ لکھنے کی وجہ لکھو آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے
تو بیرنگ بھیجو۔

غالب۔ سوموار ۷۔ دسمبر ۱۹۰۷ء

ایضاً

مہاراج آپ کا مہربانی نامہ پہنچا۔ دل میرا اگرچہ خوش نہ ہوا۔ لیکن ناخوش بھی نہ رہا۔ بہر حال مجھ کو کہ نالائق و ذلیل ترین خلایق ہوں اپنا دُعا گو سمجھتے رہو۔ کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کریں۔ میرے قصیدے دیکھو۔ تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو۔ کہ اُن کی مدح کتنی ہے۔ میرزا تیم الدین بہادر حیاتِ خلص کے دیوان کے دیباچہ کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ دیوانِ حافظ کی بموجب فرمائش جان جا کو ب بہادر کے لکھی ہے، اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں اُن کا نام اور اُن کی مدح آئی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی اور مطالب ہیں۔ واللہ باللہ کسی شاہزادے یا امیرِ زاد کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اُس کی مدح نہ کرتا کہ جتنی تمہاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمہاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمہارے نام کا بدل کر اس کے عوض ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ بھٹسی میسری روش میں نہیں۔ ظاہر اتم خود فکر نہیں کرتے اور حضرات کے

ہکاٹے میں آجاتے ہو وہ صاحب تو پیشتر اس نظم و نشر کو مہل کہیں گے
 کس واسطے کہ اُن کے کان اس آواز سے آشنا نہیں جو لوگ کہ قاتل
 کو اچھے لکھنے والوں میں جائیں گے وہ نظم و نشر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے
 ہمارے شفیق منشی نبی بخش صاحب کو کیا عارضہ ہے کہ جس کو تم لکھتے
 ہو کہ ماء الجبن سے بھی نہ گیا۔ ایک نسخہ طب محمد حسین خانی میں لکھا ہے:
 اور وہ بہت بے ضرر اور سود مند ہے مگر اثر اس کا دیر میں ظاہر ہوتا ہے۔
 وہ نسخہ یہ ہے کہ پان سات سیر پانی لیویں اور اُس میں سیر چھپے تو بھر
 چوب چینی کوٹ کر ملا دیں اور اس کو جوش کریں اس قدر کہ چارم پانی
 جل جاوے پھر اُس باقی پانی کو چھان کر کوری ٹھلیا میں بھر رکھیں
 اور جب باسی ہو جائے اُس کو پیئیں۔ جو غذا کھایا کرتے ہیں کھایا کریں
 پانی دن رات جب پیاس لگے یہی پیئیں تیرید کی حاجت پڑے اسی
 پانی میں پیئیں روز جوش کروا کر چھنوا کر رکھ چھوڑیں۔ برس دن میں اس
 کا فائدہ معلوم ہوگا۔ میرا سلام کہ کر یہ نسخہ عرض کر دینا آگے اُن کو اختیار ہے۔

چودھری عبد الغفور کے نام

میرے مشفق آپ کا خط آیا اور اس کے آنے نے تمہاری رنجش کا

دس سو سو میرے دل سے مثلاً ایک قاعدہ آپ کو بتاتا ہوں اگر اس کو
 منظور کیجئے گا تو خطوط کے نہ پہنچنے کا احتمال اٹھ جائے گا اور جسٹری
 کا در دسر جاتا رہے گا آدھ آنہ نہ سی ایک آنہ سی آپ بھی خط پیرنگ بھیجا
 کیجئے اور میں بھی پیرنگ بھیجا کروں۔ پیڈ خطوط تلف بھی ہوتے ہیں۔
 اس قاعدہ کا جیسا کہ میں واضح ہوا ہوں بادی بھی ہوا اور یہ خط پیرنگ
 بھیجا۔ پٹن جاری ہو گیا۔ تین برس کا چڑھا ہوا روپیہ مل گیا بعد ازاں
 قرض معاشیہ پچھتے اب ماہ ماہ روپیہ ملتا ہے مگر سی تین مہینے بتمبر الکتوبر
 نومبر میں گئے دسمبر ۱۸۷۷ء سے تنخواہ ششماہی ہو جائے گی۔ اس سے
 بڑھ کر یہ بات ہے کہ چار روپیہ سیکڑہ سالانہ عموماً وضع ہوا کرے گا۔ اس
 حساب سے میرے حصہ میں ڈھائی روپیہ مہینہ آیا، چھپتے کے ساتھ
 رہیں گے۔ کچھ رام پور سے ماہ ماہ آتا ہے یہ دونوں آمدنییں مل کر خوش
 و ناخوش گزارہ ہو جاتا ہے۔ یہاں شہر ڈھ رہا ہے بڑے بڑے نامی بازار
 خاص بازار اور اردو بازار اور خاتم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک
 قصبہ تھا اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے صاحبان امکنہ و دکانیں نہیں
 بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دوکان کہاں تھی برسات بھر
 مینہ نہیں برسا اب تیشہ اور کلند کی طغیانی سے مکانات گر گئے۔ نڈ

گراں ہے موت ارزاں ہے۔ میوہ کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش
 کی دال ۸ سیر۔ باجرا ۱۲ سیر۔ گیہوں ۱۳ سیر۔ چنے ۱۶ سیر گھی ڈیڑھ سیر۔ ترکاری
 منگی۔ ان سب باتوں سے بڑھکر یہ بات ہے کہ کنوار کا نہیںناجسے جاٹے
 کا دوار کہتے ہیں پانی گرم دھوپ تیز اور لو چلتی ہے جیٹھ اساڑھ کی
 سی گرمی پڑتی ہے۔ حضرت رفعت درجہ جناب صاحب عالم کی خدمت
 میں دوستانہ سلام اور فریدانہ بندگی بالکسار تمام عرض کرتا ہوں۔ حضرت
 کو کس راہ سے میرے آنے کا انتظار ہے میں نے مرشد زادہ کے خط میں
 کتب اپنا عزم لکھا یا کسی نے آپ سے میری زبانی کہا۔ کہ آپ روز روپ
 کے آقر سے اطلاع چاہتے ہیں۔ ہاں آپ کی قدمبوسی کی تمنا اور نور اللہ
 کے دیدار کی آرزو حد سے زیادہ ہے اور ایسا جانتا ہوں کہ یہ آرزو گور
 میں لے جاؤں گا۔ تنخواہ کے اجراء کا حال اور مستقبل میں اُس کے وصول
 کی صورت۔ اُن سطروں سے جو آغاز مکتوب میں چودھری عبدالغفور صاحب
 کی خدمتیں لکھی گئی ہے مع روداد شکر معلوم کر لیجے گا۔ لالہ گوہنہ پرشاد صاحب
 ہنوز میرے پاس نہیں آئے ہیں۔ دُنیا دار نہیں۔ فقیر خاکسار ہوں۔ تواضع
 میری نحو ہے۔ انجام مقاصد خلق میں حتی الوسع کی کروں تو ایسا نصیب
 نہ ہوا انشاء اللہ العزیز وہ فقیر سے راضی و خوشنود رہیں گے۔ جناب مستطاب
 محمد امیر صاحب کی خدمتیں بعد سلام و نیاز گزارش ہے کہ میرے پاس حضرت کا

سلام پیام سوائے ابکی بار کے کبھی نہیں پہونچا۔ اب ان سطور کو اپنا ذریعہ
افتخار سمجھا اور نوید مقدم مبارک سے بہت خوش ہوا۔ یہ جو خانہ کوچی و
گریز پانی اور بے اطمینانی کا آپ کو مجھ پر گمان ہے اور اس کا رنج ہے۔
یہ خلاف واقع کسی نے آپ سے کہا ہے میں مع نزن و فرزند ہر وقت
اسی شہر میں قلم خون کا شنوار رہا ہوں دروازہ سے باہر قدم نہیں رکھا
نہ پکڑا گیا نہ قید ہوا نہ مارا گیا کیا عرض کروں کہ میرے خدا نے مجھ پر کیسی
عنایت کی اور کیا نفسِ مطہینہ بخشا جان و مال و آبرویں کسی طرح کافر
نہیں آیا۔ تنخواہ جس کو حضرت نے یومیہ لقب دیا ہے اس کا حال اوپر
کی تحریر سے دریافت ہو گا۔ فیکر کو اپنا دوست اور معتقد اور شائق تصور
فرماتے رہے۔ گلام شد زادہ مرتضوی دودمان سید شاہ عالم کو سلام و دعا۔
ڈپٹی صاحب سے مجھ سے ملاقات کثرت سے نہیں ہے ان کو کثرت
اشغال سے فرصت نہیں مجھ کو افراط و تفریط سے طاقت نہیں اگر بحسب اتفاق
کبیں ملاقات ہو گئی تو آپ کا سلام کہہ دوں گا۔ آپ اپنے اخوان عالی شان
کو میرا سلام پہونچا دیجئے گا۔

بندہ شاہ شہناز شہناز شہناز

ایضاً

بندہ پروردہ پر سون تمہارا خط آیا آج لکھ رکھتا ہوں، کل ڈاک میں

بھجوا دوں گا میرا قیاس اس کا مقتضی ہے کہ پیر و مرشد صلتا
 عالمِ منجہ سے آرزو وہیں اور وہ اس کی یہ ہے کہ میں نے ممتاز و اختر
 کی شاعری کو ناقص کہا تھا اس رقعہ میں ایک میزان عرض کرتا ہوں۔
 حضرت صاحب ان صاحبوں کے کلام یعنی ہندیوں کے اشعار کو
 قتیل و واقف سے لیکر بیدل ناصر علی تک اس میزان میں تو لیں
 میزان یہ ہے رود کی و فردوسی سے لیکر خاقانی و سنائی و انوری و
 غیر ہم تک ایک گروہ۔ ان حضرات کا کلام تھوڑے تھوڑے تفاوت
 سے ایک وضع پر ہے! پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہوئے۔
 سعدی و جامی و ہلالی یہ اشخاص متعدد نہیں۔ فغانی ایک اور شیوہ
 خاص کا مبدع ہوا۔ خیال لہائے نازک و معانی بلند اس شیوہ کی
 تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی سے سبحان اللہ قالبِ سخن میں
 جان پڑ گئی اس روش کو بعد اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا
 چرچا دیا صائب و کلیم و سلیم و قدسی و حکیم شغانی اس زمرہ میں ہیں
 رودکی و اسدی و فردوسی یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا اور سعدی
 کے طرز نے بہ سبب سہل ممتنع ہونے کے ردِ اجماع نہ پایا۔ فغانی کا انداز پھیلا
 اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے تو اب طرزیں تین ٹھہری
 ہیں خاقانی اس کے اقران۔ ظہوری اس کے امثال۔ صائب اس کے نظائر

خالصاً اللہ ممتاز و اختر و غیر ہم کا کلام ان تین طرزوں میں سے کس طرز پر ہے جبے شبہ فرماؤ گے کہ یہ طرز اور ہی ہے۔ پس تو ہم نے جانا کہ یہ طرز چوتھی ہے کیا کہنا ہے خوب طرز ہے اچھی طرز ہے مگر فارسی نہیں ہے ہندی ہے دار الفرب شاہی کا سکہ نہیں ہے ٹکسال باہر ہے داد داد انصاف انصاف۔

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار زیک جام اندر بزم سخن مست
وے بابا دہ بعضے حرفیاں نمار چشم ساقی نیسز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم در اے شاعری چیز و گزشت
وہ چیز اکثر حصے میں پارسیوں کے آئی ہے ہاں اردو زبان میں وہ چیز اہل ہند نے پائی ہے۔

میر تقی علیہ الرحمۃ۔ بیت
بدنام ہو گئے جانے بھی دو امتحان کو رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو
سودا۔ بیت

دکھلائیے لے جا کے تجھے مھر کا بازار خواہاں نہیں لیکن کوئی داں خنکس اں کا
مومن خاں۔ شعر

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
ناخن کے یہاں کہ تر آتش کے یہاں بیشیرہ تیز نشتر ہیں مگر مجھے کوئی اٹھا شہرقت یا دیکھتا

میر مہدی مجروح کے نام

میر مہدی تم میری عادت بھول گئے۔ ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ میں اس مہینے میں رامپور کیونکر رہتا۔ نواب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے رہے۔ برسات کے آسموں کا لالچ دیتے رہے مگر بھائی میں اس انداز سے چلا کہ چاند لڑکے دن یہاں آپہنچا۔ یکشنبہ کو غرہ ماہ مقدس ہو اسی دن سے ہر روز صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں شب مسجد جامع جا کر نماز تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جوہی میں آتا ہے تو وقت صوم ہوتا باغ میں جا کر روزہ کھولتا ہوں اور سر پانی پیتا ہوں۔ واہ واہ کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے۔ اب اصل حقیقت سنو۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں انھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا ورنہ گرمی برسات وہاں کا لٹا اب بشرط حیات جریدہ بعد برسات جاؤں گا اور بہت دن تک یہاں نہ آؤں گا۔ قرار داد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے جس کو یہ دسواں مہینا ہے، سو روپیہ مجھے ماہ ماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا تو سو روپے مہینا بنام دعوت اور دیامنی

راپور رہوں تو دو لکھو مینا پاؤں اور دلی رہوں تو سو روپے بھائی
سو دو سو میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوشا
و شاگردانہ دیتے ہیں مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ہیں۔ ملاقات بھی دوستانہ
رہی معافقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے وہ صورت
ملاقات کی ہے لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی۔ بس بہر حال
غیبت ہے رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر چاہئے۔ کمی کا شکوہ
کیا۔ انگریز کی سرکار سے دس ہزار روپیہ سال ٹھہرے۔ اُس
میں سے مجھ کو ملے ساڑھے سات سو روپے سال۔ عزت میں وہ
پایا جو رئیس زادوں کے واسطے ہوتا ہے۔ خاں صاحب بیار
نہربان دوستانہ القاب۔ خلعت سات پارچہ اور چغیر و سر پہنچ
و مالائے م و اریدر بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیر کرتے
تھے۔ بخششی۔ ناظر۔ حکیم کسی سے تو قیسر کم نہیں مگر فائدہ وہی قلیل
سو میری جان یہاں وہی نقشہ ہے۔ کوٹھڑی میں بیٹھا ہوں۔
ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آ رہی ہے۔ پانی کا جھجر بھرا ہوا ہے۔ حَقّ
پی رہا ہوں یہ خط لکھ رہا ہوں تم سے باتیں کرنے کو بی چاہا باتیں
کر لیں۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور میر نصیر الدین صاحب
کو یہ خط پڑھا دینا اور میری دعا کھدینا۔ جمعہ ۱۶۔ اپریل۔

ایضاً

واہ حضرت کیا خط لکھا ہے۔ اس خرافات کے لکھنے کا فائدہ۔
 بات اتنی ہی ہے کہ میرا پلنگ مجھ کو بلا۔ میرا بچھونا مجھ کو بلا۔ میرا حجام مجھ کو
 بلا۔ میرا بیت الخلا مجھ کو بلا۔ رات کا وہ شور کوئی آئیو کوئی آئیو فرو ہو گیا میری
 جان بچی۔ میرے آدمیوں کی جان بچی۔ سہ کنوں شب من شب است روزم
 روز است پڑ بھی تم نے یہ نہ لکھا کہ میرن صاحب کو میرا خط پہنچایا نہ
 پہنچایا میں گمان کرتا ہوں کہ نہیں پہنچا۔ اگر پہنچتا تو بیشک وہ تمہاری
 نظر سے گزرتا اور میرن صاحب اُس کی اصل حقیقت تم سے پوچھتے اور
 اس صورت میں یہ بھی ضرور تھا کہ تم اس واہیات کے بدلے مجھ کو وہ روداد
 لکھتے جو میرن صاحب میں اور تم میں پیش آئی۔ پس اگر جیسا کہ گمان ہے
 خط نہیں پہنچا تو خیر جانے دو۔ اگر خط پہنچا ہے تو میرن صاحب کے خط
 کے جواب لکھوانے میں تم نے میرا دم ناک میں کر دیا تھا۔ اب اُنے
 میرے خط کے جواب کا تقاضا کیوں نہیں کرتے۔ میرے خط کے جواب
 کے باب میں کیوں نہیں کہتے نہ صاحب یہ کچھ بات نہیں۔ میرے
 خط کا جواب ان سے لکھو اگر بھواؤ یہاں کا وہ حال ہے جو دیکھ گئے ہو۔
 پانی گرم۔ ہوا گرم۔ تپیں مستولی۔ اناج منگا۔ بیچارہ منشی امیر احمد حسین کا بھتیجا
 میرا داد علی آشوب کا بیٹا۔ محمد میر۔ شب گذشتہ کو گذر گیا۔ آج صبح کو اُس کو

دفن کر آئے۔ جوان صالح۔ پرہیزگار مومنین کا پیش نماز تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا
 اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ مجتہد العصر کا حکم بجالاؤنگا اور نہ رئیس کو بلکہ مدارلہام ریاست
 کو لکھوں گا۔ رئیس میرے سوال کا جواب قلم انداز کر جائے گا اور مدارلہام
 امر واقعی لکھ بھیجے گا۔ میرن صاحب کو دُعا اور کہنا کہ بھلا صاحب نے تم نے
 ہمارے خط کا جواب نہیں لکھا۔ ہم بھی تمہاری طرز کا اتباع کریں گے۔ حکیم
 میر اشرف علی کو دُعا کہنا اور کہنا کہ اگر تم میں اُن میں راہ و رسم تعزیت و
 تنہیت ہو تو میر احمد حسین کو خط لکھو اور یہ بھی ان کو معلوم ہو کہ حفیظ یہاں
 آیا ہوا ہے۔ قبائل تمہارے یہیں ہیں اگر وہاں کچھ رسائی ہو تو خیر ورنہ
 کیوں نہیں چلے آتے ۵

میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جان کروں کیا کہ یہاں گھر رہے ہیں مکان
 برسات کا حال نہ پوچھو خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں
 کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں۔ عالم بیگ خاں کے کٹرہ کی طرف
 کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا۔
 سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا تجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں
 چھلنی ہو گئیں ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برستے تو چھت گھٹنہ بھر برستے۔ کتابیں
 قلمدان سب توشہ خانہ میں۔ فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا۔ کہیں چلچلی
 دھری ہوئی۔ خط کہاں بیٹھ کر لکھوں۔ پانچ چار دن سے فرصت ہے۔ ملک

مکان کو فکر مرمت ہے۔ آج ایک امن کی صورت نظر آئی لہذا آؤ میری
 کے خط کا جواب لکھوں۔ اور کی ناخوشی راہ کی محنت کشی۔ تپ کی حرارت
 گرمی کی شرارت۔ یاس کا عالم کثرت اندوہ و غم۔ حال کی فکر۔ مستقبل
 کا خیال۔ تباہی کا رنج۔ آوارگی کا ملال جو کچھ کہو وہ کم ہے۔ بالفعل تمام
 عالم کا ایک سا عالم ہے۔ سنتے ہیں کہ نومبر میں ہمارا جو اختیار ملے گا۔
 مگر وہ اختیار ایسا ہوگا۔ جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضہ قدرت
 میں رکھا۔ آدمی کو بدنام کیا ہے۔ بارے رفیع مرض کا حال لکھو خدا کرے
 تپ جاتی رہی ہو۔ تندرستی حاصل ہو گئی ہو میر صاحب کتے ہیں۔ ۵
 تندرستی ہزار نعمت ہے ۶ ہائے پیش مصرعہ مرزا قربان علی بیگ سالک
 نے کیا خواب بہم پہنچایا ہے مجھ کو پسند آیا ہے ۵

تنگدستی اگر نہ ہو سالک تندرستی ہزار نعمت ہے
 مجتہد العصر میر سرفراز حسین صاحب کو دُعا۔ اہا ہا ہا میر افضل علی صاحب
 کہاں ہیں۔ حضرت یہاں تو اس نام کا کوئی نہیں ہے۔ لکھنؤ کے
 مجتہد العصر کے بھائی کا نام میرن صاحب تھا۔ جے پور کے مجتہد العصر کے
 بھائی میرن صاحب کیوں نہ کہلائیں۔ ہاں بھائی۔ میرن صاحب بھلا
 اُن کو ہماری دُعا کہنا۔

ایضاً

جان غالب تمہارا خط پہنچا غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے ۵

ہر اک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے۔ مصحح بدل دینے سے یہ شعر کس رتبہ کا ہو گیا۔ اسے میر ہمدی تجھے شرم نہیں آتی۔ میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے۔ اسے اب اہل دہلی ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے۔ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو باقی رہی۔ باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔ خس کی ٹٹی ٹپڑا ہوا اب کہاں۔ نطف وہ تو اُسی مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی جلی اور چھت اور سمت بدلی ہوئی ہے۔ بہر حال میگزرد مصیبت عظیم ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈوگی کے کوئیں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنواں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک بے مبالغہ ایک صحرائی ووق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ گراٹھ جائیں تو ہو کا عالم ہو جائے یاد کرو مرزا گوہر کے باغچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھلاب وہ باغچے کے صحن کے برابر ہو گیا یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے نکھلے رہے ہیں باقی سب اٹ گیا۔ کشمیر دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک

میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ۔ دھوبی واڑہ۔ راجی گنج۔ سعادت خاں کا کٹرہ۔
 جرنیل کی بیوی کی حویلی راجی داس گودام والے کے مکانات۔ صاحب
 رام کا باغ حویلی۔ ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا
 تھا۔ اب جو کنوے جاتے رہے اور پانی گوبر نایاب ہو گیا۔ تو صحرائے صحرائے
 کر بلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا
 کہتے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد رے بندہ خدا۔ اردو بازار نہ رہا
 اردو کہاں دلی کہاں، واللہ اب شہر نہیں ہے۔ کیمپ ہے چھاؤنی
 ہے۔ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر اور آلور کا حال کچھ اور ہے مجھے اور انتقال
 سے کیا کام۔ الگزنڈر مدرنی کا کوئی خط نہیں آیا نظر ہر اُن کی مصاحبت
 نہیں ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب
 اور نصیر الدین کو دعاء۔

نوابین الدین احمد خاں صاحب بہادر رئیس لوہارو کے نام

اقبال نشانہ بخیر و عافیت و فتح و نصرت لوہارو پہنچنا مبارک ہو۔
 مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع اکمل المطابع میں چند اخبار
 میرے مسودات اردو کے جمع کرنے پر اور اُس کے چھپوانے پر آمادہ
 ہوئے ہیں مجھ سے مسودات مانگتے ہیں اور اطراف و جوانب سے

بھی فراہم کئے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہوا وہاں بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمہارے پاس بہت ہوں گے اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بسیل ڈاک بھیج دو گے یا آج کل میں کوئی ادھر آنے والا ہو اُس کو دیدو گے تو موجب میری خوشی کا ہوگا اور میں ایسا جانتا ہوں اُس کے چھاپے جانے سے تم بھی خوش ہو گئے ہو گویا غالب

ایضاً

یکشنبہ ۱۶۔ فروری ۱۸۶۲ء ہنگام نیمروز صاحب کل تمہارے خط کا جواب بھیج چکا ہوں پہونچا ہوگا آج صبح کو بھائی صاحب کے پاس گیا بھائی ضیاء الدین خاں اور بھائی شہاب الدین خاں بھی وہیں تھے مولوی صدر الدین میرے سامنے آئے حکیم محمود خاں کے طور پر معالجہ قرار پایا ہے۔ یعنی انھوں نے نسخہ لکھ دیا ہے سو اس کے موافق حبوب بن گئی ہیں۔ نقوع کی دوائیں آج آکر بھیگیں گی۔ کل حبوب کے اوپر وہ نقوع پیا جائے گا مگر انداز واداسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حضرت مریض کی اور ان کے ہوا خواہوں کی رائے ہیں قصد اس متعلج کا مذنب ہے نسخہ کی حقیقت کو میزان نظر میں تول رہے ہیں۔ استاد میر جان بھی تھی نیم نامعقول مرزا اسد بیگ بھی تھے۔ سب طرح

خیریت ہے۔ کل تمہارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں ایک کپ ہے مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ۔ باقی سراسر ہنود معزول بادشاہ کے ذکور بولنے لیسے ہیں وہ پانچ پانچ روپیہ مہینا پاتے ہیں۔ امراے اسلام میں سے اموات گنو۔ حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپیہ روز کا پنشن دار سو روپیہ مہینا کاروزینہ دار بن کر گیا۔ میرنا مرالدین باپ کی طرف سے بیڑا دہ نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان۔ بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے بیمار پڑا نہ دوا نہ غذا انجام کار مر گیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجیز و تکفین ہوئی۔ احبا کو پوچھو ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آگیا اُس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ ٹکے کی آمینیں مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھے پھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڑے صاحب ساری املاک بچکر نوش جان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے ضیاء الدولہ کے پاس پانسو روپیہ کرایہ کی واگداشت

ہو کر پھر قرق ہو گئی تباہ خراب لاہور گیا وہاں پڑا ہوا ہے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔
 قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجہ اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ
 روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی امارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی
 یہاں کیوں پایا جائے جو حکما کا حال لکھا ہے وہ بیان واقع ہے صلیحا اور
 زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے اُس کو بھی سچ جاننے والے
 والد ماجد کی طرف سے خاطر جمع رکھو۔ آسب کا گمان ہرگز نہ کرو خدا
 چاہے تو استعمال ایاریات کے بعد بالکل اچھے ہو جائیں گے اور اب بھی
 خدا کے فضل سے اچھے ہیں۔ عافیت کا طالب غالب۔

منشی فضل حسین خاں صاحب کے نام

کیوں صاحب یہ چاہتیجا ہونا اور شاگردی و استادی سب پر پانی
 پھر گیا۔ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے
 تم کیا غضب ٹوھاتے۔ میرا کلام خرید آٹھ دس روپیہ کی سو وہ بھی میں
 یہ نہیں کہتا کہ مجھ کو دے ڈالو تم کو مبارک رہے مجھ کو مستعار دو۔ میں
 اس کو دیکھ لوں جو میرے پاس نہیں ہے اس کی نقل کر لوں پھر تم کو
 واپس بھیج دوں۔ اس طرح پر طلب پر نہ دینا دلیل اس کی ہے کہ
 مجھ کو جھوٹا جانتے ہو۔ میرا اعتبار نہیں یا مجھ کو آزاد دینا اور مستانہ بدل

منظور ہے وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دیدو۔ واللہ باللہ اس میں سے جو میرے پاس نہیں ہے نقل کر کے تم کو بھیج دوں گا۔ اگر تم کو واپس نہ دوں تو مجھ پر لعنت اور اگر تم میری قسم کو نہ مانو اور کتاب حامل رقعہ کو نہ دو تو تم کو آفریں۔

یوسف مرزا صاحب کے نام

یوسف مرزا تجھ کو کیوں کر لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا۔ اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر۔ یہ ایک شیوہ فرسودہ آبنائے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو ہاے ایک کاکلیجا کٹ گیا ہے اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں نہ تڑپے گا۔ صلاح اس میں نہیں بتائی جاتی۔ دُعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا پھر باپ مرا مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سرو پا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔ تمہاری دادی لکھتی ہیں کہ ربائی کا حکم ہو چکا تھا یہ بات اگر سچ ہے تو جو ان مرد ایکبار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا نہ قید حیات رہی نہ قید فرنگ۔

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد

پیدائش دہلی ۱۸۳۱ء وفات لاہور ۱۹۱۱ء

مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر شرفاء دہلی میں ایک نامور شخص تھے۔ اردو اخبار نامی اردو زبان کا پہلا اخبار شمس العلماء میں مولوی محمد باقر ہی نے دہلی میں نکالا تھا۔ آزاد نے عربی فارسی کی تعلیم ابتدا سے پرائے دہلی کالج کے اورینٹل ڈیپارٹمنٹ میں پانی اردو نظم و نثر لکھنے کی استعداد رکھنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام بھی اور نظم میں ذوق کے شاعر و رشید تھے جب غدر کے بعد مولوی محمد باقر مارے گئے تو آزاد کو وطن چھوڑ کر دکن بھاگنا پڑا ایک عرصہ کی آوازہ گردی کے بعد ان کو لاہور آنا نصیب ہوا اور وہاں مرثیہ تعلیم کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ رائے بہادر ماسٹر پیار سے لال صاحب کی سفارش اور مرثیہ تعلیم کے ڈائریکٹر ممبر فلر صاحب کی قدر وانی آزاد کی ترقی کا باعث ہوئی۔ پنجاب میں گورنمنٹ کی طرف سے ایک اخبار سرکاری اخبار کے نام سے نکلتا تھا۔ آزاد کچھ دن اس کے اسسٹنٹ

اڈیٹر رہے پھر پنجاب گورنمنٹ کے میرنٹی پنڈت من بھول کے ساتھ ششہ ہوا
 میں کابل اور بدخشاں گئے اور وہاں سے لوٹ کر لاہور کے سرکاری کالج
 میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ ۱۸۸۷ء میں ان کو ایران کا سفر کرنا
 پڑا جس کا تذکرہ اشارتاً کہیں کہیں سخندان پارس میں پایا جاتا ہے۔
 ۱۸۸۷ء میں ملکہ دکنوریہ کی پہلی جوہلی پر آپ کو سرکار انگریزی کی
 طرف سے شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا۔

شاہراہ قدیم سے ہٹ کر اردو شاعری کے نئے جدید روش پیدا
 کرنے کا سہرا مولوی محمد حسین آزاد کے سر پہ ہے۔ مولانا حالی مجموعہ نظم حالی
 کے دیباچہ میں فرماتے ہیں۔

”۱۸۸۷ء میں جب راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق اور لاہور
 میں مقیم تھا مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہارلڈ ڈائریکٹر
 سرشتہ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا
 تھا جو ہر مہینے ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا اس مشاعرہ
 کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ درد عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہو گئی
 تھی اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دیا جائے۔“

چنانچہ اس طرز کی کئی نظمیں۔ شب قدر۔ موسم زمستان۔ صبح امید
 خستہ وطن وغیرہ آزاد کی نظم کے مجموعوں میں چھپ چکی ہیں۔

مالی کے پودے لگانے اور کھاریوں میں پانی بننے کی بات سنا کر
 ہلا سکتا ہے..... اس کی ہر شے میں اس کا آزاد پن
 موجود ہے، اور یہ وصف ایسا ہے کہ جو شاید دُنیا کے بہت کم مصنفوں
 کے حصّہ میں آیا ہے۔

آزاد کی ایک اور صفت بھی قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ ایجاد
 اور اختراع کے ہر موقع پر اس کا ذوق سلیم یہ بتا دیتا ہے کہ کون سی
 اختراع قابل پذیرائی ہے اور کون سا ایجاد زبان کے مزاج
 اور خواص کے خلاف ہے۔ یہ ایسا نکتہ ہے کہ جس کو نئی روشنی
 کے دلدادہ مغربی ادب کی تقلید کی دُھن میں اکثر نظر انداز
 کر جاتے ہیں اور جس کے نظر انداز کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ
 ثقیل الفاظ ممل ترکیبوں اور بھدے۔ بے جوڑ محاوروں کی آمیزش
 سے زبان اپنی اصلی لطافت کو بھی کھو بیٹھی ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ اُردو کی ترقی کا اس سے بہتر وسیلہ
 نہیں ہو سکتا کہ مولوی محمد حسین آزاد کے اصولِ فن اور طرزِ تحریر
 کی پیروی کی جائے۔

زبان اُردو کی تاریخ

ماخوذ از آبِ حیات

اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دُنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ ہی آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے تم خیال کرو گے کہ شاید اس میراث قدیمی کی سند سنسکرت کے پاس ہوگی اور وہ ایسا بیج ہوگا کہ چھوٹا ہوگا اور یہیں پھلا پھولا ہوگا۔ لیکن نہیں۔ ابھی سُراغ آگے چلتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہندوستان اگرچہ بے ہمتی اور آرام طلبی کے سبب سے بدنام رہا مگر باوجود اسکے مذہب قوموں کی نگاہ میں ہمیشہ سے کھپا رہا ہے۔ چنانچہ اس کی سیر اور زرخیزی اور اعتدال ہوانے بلائے جان ہو کر ہمیشہ اُسے غیر قوموں کی گھڑ دوڑ کا میدان بنائے رکھا ہے۔ پس داناے فرنگ کہ ہر بات کا پتہ پتال تک نکالنے والے ہیں اُنھوں نے زبانوں اور قدیم نشانوں سے ثابت کیا ہے کہ یہاں کے اصلی باشندے اور لوگ تھے۔ ایک زبردست قوم نے آکر آہستہ آہستہ محل ملک پر قبضہ

کر لیا۔ یہ فتحیاب غالباً جیہوں۔ سیوں کے میدانوں سے اٹھ کر اور ہمارے شمالی سپاٹلٹ کر اس نلک میں آئے ہوں گے اس زمانہ کے گیت اور پُرانی نشانیاں دیکھ کر یہ بھی معلوم کیا ہے کہ وہ لوگ دل کے بہادر۔ ہمت کے پورے۔ صورت کے وجیہ رنگ کے گورے ہوں گے اور اُس زمانہ کی حیثیت بموجب تعلیم یافتہ بھی ہوں گے۔ موقع کا مقام اور سرسبز زمین دیکھ کر ہیں زمین گیر ہوئے اس قوم کا نام ایرین تھا اور عجیب نہیں کہ ان کی زبان وہ ہو جو اپنے اصل سے کچھ کچھ بدل کر اب سنسکرت کہلاتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہندوستان میں آکر راجہ مہاراجہ کا خطاب لیا ایران میں تاج کیانی پر دُرفش کا ویانی لہرایا۔ اپنے مذہب کا نادر طریقہ لیکر چین کو نکھر خانہ بنایا یونان کا طبقہ حکمت سے الگ جمایا روم کی عالمگیر سلطنت کی بنیاد الی اندلس پہنچ کر چاندی نکالی یورپ سے خبر آئی کہ کہیں دریا سے پھلیاں نکالتے نکالتے گوہر سلطنت پائے۔ کہیں پہاڑوں سے دھات کھودتے کھودتے لعل بے بہا نکال لائے تب اصلی رہنے والے کون تھے، اور اُن کی زبان کیا تھی؟ قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پنجاب میں اب قطعہ قطعہ کی کی زبان کہیں کچھ کچھ اور کہیں اختلاف رکھتی ہے اور یہی حال اور

اور اضلاع ہند میں ہے۔ اسی طرح اس عہد میں بھی اختلاف ہوگا اور اس عہد کی نامی زبانیں وہ ہوں گی جن کی نشانی تامل۔ اوڑیا اور تلگو وغیرہ اضلاع دکن اور مشرق میں اب تک یادگار موجود ہیں بلکہ اس حالت میں بھی اُن کی شاعری اور انشا پر دازی کستی ہے کہ یہ گھٹلی کسی لذیذ میوے کی ہے اور سنسکرت سے انھیں لگاؤ تک نہیں۔

فحیابوں نے ہندو کش کے پہاڑ اتر کر پہلے تو پنجاب ہی میں ڈیرے ڈالے ہوں گے پھر جوں جوں بڑھتے گئے ہوں گے اصلی باشندے کچھ تو لڑتے مارتے دائیں بائیں جنگلوں کی گود اور پہاڑوں کے دامن میں گھستے گئے ہوں گے اور وہی شور و رکھلائے ہوں گے چنانچہ اب تک بھی اُن کی صورتیں کے دیتی ہیں کہ یہ کسی اور بن کی پڑی ہیں۔

نہت دراز تک ایرین بھائیوں کے کار و بار ہندوستانی بھائیوں کے ساتھ ملے جلے رہے ہوں گے یہی سبب ہے کہ ایران کی تاریخ قدیم میں مہ آباد اور اُس کے زمانہ کی تقیم برہما کے زمانہ سے اولے کے رسوم و قواعد سے مطابقت دکھاتی ہے اور چاروں برنوں کا برابر پتہ لگتا ہے یہاں بودھ نے انھیں توڑا وہاں زرتشت کے مذہب نے اُسے جلا کر خاک کیا مگر ہندوؤں نے بودھ کے بعد پھر اپنی حالت

کو سنبھال لیا ایرانی اپنی حالت کو نہ سنبھال سکے۔

چاروں برنوں کی تقسیم اور اُن کا الگ تھلگ رہنا دور کے
 دیکھنے والوں کو غور کے لباس میں نظر آیا مگر حق پوچھو تو یہ کچھ بُری
 بات نہ تھی۔ اسی کی برکت ہے کہ آج تک چاروں سلسلے صاف الگ
 الگ پتلے آتے ہیں جو ہندو ہو گا ماں باپ دونوں کی طرف سے
 خالص ہو گا اور برابر اپنے قوم کا پتہ بتا سکے گا۔ جو دو غلہ ہو گا اُس کا
 سلسلہ الگ ہو جائے گا۔ اگر یہ قیدیں اس سختی کے ساتھ نہ ہوتیں تو
 تمام نسلیں خلط ملط ہو جاتیں۔ نجیب الطرفین آدمی چاہتے تو ڈھونڈتے
 نہ ملتا۔ فتحیابوں کی ان سخت قیدوں نے آپس کی بندشوں میں عجیب
 طرح کے پھندے ڈالے چنانچہ جب نسلوں کی حفاظت کا پورا بندوبست
 کر چکے تو خیال ہوا کہ شودروں کے ساتھ آٹھ پہر بات چیت رہنے سننے
 اور لین دین کرنے میں بزرگوں کی زبان دوغلی ہو جائے گی۔ اس واسطے
 کہا کہ ہر اسی زبان زبان الہی ہے اور الہی عمدتہ اسی طرح چلی
 آئی ہے چنانچہ اس کے قواعد اور اصول باندھے اور ایسے جانچ کر
 باندھے جن میں نقطہ کا فرق نہیں آسکتا اس کی پاکیزگی نے غیر لفظ
 کو اپنے دامن پر ناپاک دھبہ سمجھا اور سوا برہمن کے دوسرے کی
 زبان بلکہ کان تک گزرنے کا بھی ناجائز ہوا۔ اس سخت قانون نے

بڑا فائدہ یہ دیا کہ زبان ہمیشہ اپنی اصلیت اور بزرگوں کی یادگار کا خالص نمونہ نمایاں کرتی رہے گی بر خلاف ایرانی بھائیوں کے ان کے پاس زبانی سند بھی نہ رہی۔

اسی بنیاد پر فتحیابوں کی بلند نظری نے اس کا نام سنسکرت رکھا جس کے معنی آراستہ و پیراستہ۔ صنعتی۔ منزہ۔ مصفا۔ مقدس جو چاہو سمجھ لو۔ ان کے قواعد زبان بھی ایسے مقدس ہوئے کہ بزرگان دین ہی اُسے پڑھائیں تو پڑھائیں بلکہ اس طرح پکار کر پڑھنا بھی گناہ ہوا کہ شودر کے کان میں آواز پڑے۔ اس زبان کا نام دیوبانی ہوئی زبان الہی۔ زبان دان وید کے سنہ ترتیب جس سے عہد کی زبان کا پتہ لگے ۱۴ سو برس قبل سنہ عیسوی خیال کرتے ہیں۔ اس وقت ان فتحیابوں کی باتیں اس ملک اور ملک والوں کے ساتھ ایسی سمجھ لو جیسے ہندوستان میں پہلے پہلے مسلمانوں کی حالتیں۔ ان کے سنسکرت زبان کے مخرج اور تلفظ یہاں کے لوگوں میں آکر کچھ اور ہو گئے ہوں گے۔ اس لئے گھروں اور بازاروں میں باتیں کرنے کو قطعہ قطعہ میں پر اکرت زبانیں خود بخود پیدا ہو گئی ہوں گی۔ جیسے اسلام کے بعد اردو چنانچہ مالگدی (پالی) سوہینی۔ مہاراشٹری وغیرہ قدیمی پر اکرتیں اب بھی اپنی اپنی قدامت کا پتہ

بتلائی ہیں۔ ان کی سیاہی میں سیکڑوں لفظ سنسکرت کے چمکتے نظر آتے ہیں مگر بگڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دیکھا! پرکت کے معنی ہیں طبیعت اور جو طبیعت سے نکلے چنانچہ ہم چند لغات سنسکرت کا جامع بھی یہی کتاب ہے اس کے علاوہ سنسکرت مہذب اور مقدس اور پراکرت غیر مذہب لوگوں کو کہتے ہیں۔ پس ایسی ایسی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فمیدہ لوگ تھے ہر بات کو خوب سمجھتے تھے اور جو کچھ انھوں نے کیا سمجھ کر کیا ہے۔

راجہ بھوج کے عہد کی نالک پٹکیں کہتی ہیں کہ ان عہدوں میں علمی کتابیں اور درباری زبان تو سنسکرت تھی۔ مگر چونکہ معاملہ خاص و عام سے پڑتا ہے اس لئے گفتگو میں پنڈتوں کو بھی پراکرت ہی بولنی پڑتی تھی۔ پراکرت صاف سنسکرت کی بیٹی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں ہزاروں لفظ سنسکرت کے ہیں اور ویسے ہی قاعدے صرف نحو کے بھی ہیں سنسکرت کی اتنی حفاظت ہوئی پھر بھی منوسمرتی ویدوں کی ترتیب سے کئی سو برس بعد لکھی گئی تھی۔ اس میں اور وید کی زبان میں صاف فرق ہے اور اب اور بھی زیادہ ہو گیا۔ لیکن چونکہ سلطنت اور معتبر تصانیف پر مذہب کا چوکیدار بیٹھا تھا اس لئے نقصان کا بہت خطرہ نہ تھا

کہ دفعہ ۵۴۳ برس قبل عیسوی میں بدھ مذہب کے بانی شاکمنی پیدا ہوئے وہ مگدھ دیس سے اٹھے تھے اس لئے وہیں کے پرکرت میں وعظ شروع کیا کیونکہ زیادہ تر کام عوام سے تھا عورت مرد سے لیکر بچے اور بوڑھے تک یہی اس دیس کی زبان تھی۔ انکی آتش زبانی سے مذہب مذکور ایسا پھیلنا شروع ہوا جیسے بن میں آگ لگے۔ دیکھتے دیکھتے دھرم حکومت۔ رسم و رواج دین آئین سب کو جلا کر خاک کر دیا اور مگدھ دیس کی پرکرت کل دربار اور کل دفتروں کی زبان ہو گئی۔ اقبال کی یاد رومی نے علوم و فنون میں بھی ایسی ترقی دی کہ تھوڑے ہی دنوں میں عجیب و غریب کتابیں تصنیف ہو کر اسی زبان میں علوم کے کتب خانے بچ گئے اور فنون کے کارخانے جاری ہو گئے کہیں کہیں کونہ گوشہ میں جہاں کے راجہ وید کو مانتے رہے وہاں ویدوں کا اثر رہا۔ باقی راج کے دربار اور علمی سرکار سب ماگدھی ہی لکھی ہوئی۔ ان کے حوصلے وسیع ہو کر دعوے بڑھے اور باوازا بلند کمدیا کہ ابتدائے عالم سے تمام زبانوں کی اصل ماگدھی ہے۔ برہمن اور کل انسان بات کر نیکی لائق بھی نہ تھے اصل میں ان کی بھی اور قادر مطلق بودھ کی زبان بھی یہی ہے۔ اس کے صرف نحو کی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں۔ خدا کی قدرت دیکھو جو لونڈی تھی وہ رانی بن بیٹھی اور رانی منہ چھپا کر کونے میں بیٹھ گئی۔

زمانہ نے اپنی عادت کے بموجب (تخمیناً ۱۵ سو برس بعد) بودھ مذہب کو بھی رخصت کیا اور ان کے ساتھ ان کی زبان بھی رخصت ہوئی۔ شکر اچا سچ کی برکت سے برہمنوں کا ستارہ ڈوبا ہوا پھر ابھر کر چکا اور سنسکرت کی آج تاب بھی شروع ہوئی راجہ بکرماجیت کے عہد میں جو روشنی اسکی فصاحت نے پائی آج تک لوگوں کی آنکھوں کا اُجالا ہے۔ اُس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ دربار سلطنت اور اعلیٰ درجہ کے لوگوں کو سنسکرت بولنا اعتبار و افتخار کی سند تھا اور پراکرت عوام کی زبان تھی۔ کیونکہ اس عہد میں جو کالی داس ملک الشعراء شکر تلامک لکھا ہے۔ سبھ میں دیکھ لو بادشاہ۔ امرا اور پنڈت سنسکرت بول رہے ہیں کوئی عام آدمی کچھ کہتا ہے تو پراکرت میں کہتا ہے گیارھویں صدی عیسوی سے پہلے راجہ بھرت کے عہد میں برج کے قطعہ کی وہ زبان تھی جسے ہم آج کی برج بھاشا کی اصل کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت میں بھی ہر قطعہ میں اپنی اپنی بولی عام لوگوں کی حاجت روائی کرتی تھی اور سنسکرت تصنیفات اور خواص کی زبانوں کے لئے باعث برکت تھی کہ دفعۃً زمانہ کی شعبہ بازی نے ایک اور رنگ بدلا۔ یعنی اسلام کا قدم ہندوستان میں آیا۔ اس نے پھر ملک و مذہب کو نیا انقلاب دیا اور اسی وقت سے زبان کا اثر زبان پر دوڑنا شروع ہوا۔

سنسکرت اور اصل فارسی یعنی ژند و استا کی زبان ایرانیں کے رشتہ سے ایک دادا کی اولاد ہیں مگر زمانے کے اتفاق کو دیکھو کہ خدا جانے کسے سو برس یا کے ہزار برس کی پچھڑی ہوئی نہیں اس حالت سے اگر ملی ہیں کہ ایک دوسرے کی شکل نہیں پہچان سکتی۔

ہندوستانی بہن کی کہانی تو سن چکے اب ایرانی بہن کی بھی داستان سن لو کہ اُس پر وہاں کیا گذری اول تو یہی قیاس کرو کہ اس ملک نے جو ایران نام پایا شاید وہ لفظ ایرانی ہی کی برکت ہو۔ پھر یہ بھی کچھ تھوڑے تعجب کا مقام نہیں کہ جس طرح ہندوستانی بہن پر وقت بوقت بودھ وغیرہ کے حادثے گزرے اسی طرح اس پر بھی وہاں انقلاب پڑتے رہے یا وجود اس کے اب تک ہزاروں لفظ فارسی اور سنسکرت کے صاف ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔ ایرانی بہن جب اس ملک میں جا کر بسی ہوگی تو مدت تک اُن کے مذہب۔ رسم و رواج اور زبان جیسے تھے ویسے ہی رہے ہوں گے مگر اس زمانہ کی کوئی تصنیف ہاتھ نہیں آئی کچھ ٹوٹا پھوٹا پستا ملتا ہے تو زرتشت کے وقت سے ملتا ہے جسے آج تخمیناً ۲۴ برس ہوئے اس نورانی موجد نے شعلہ آتش کے پردہ میں توحید کے مسئلہ کو رواج دیا۔ مذہب مذکور نے سلطنت کے بازوؤں سے

زور پکڑا اور ایران سے نکل کر دوسو برس کے قریب اطراف و جوانب کو دبتا رہا۔ یہاں تک کہ یونان سے سکندر طوفان کی طرح اٹھا اور ایشیا کے امن و امان کو تہ و بالا کر دیا۔ جو مصیبت بودھ کے ہاتھ سے بید شاستر پر بڑی تھی وہاں وہی مصیبت ژند و استا پر آئی چنانچہ جس آگ نے زرتشت اور جاما سب کے متبرک ہاتھوں سے آتش خانوں کو روشن کیا تھا جس کے آگے گشتا شب نے تاج اتار کر رکھا جس کی درگاہ میں اسفندیار نے گرز اور تلوار چڑھائی وہ یونان کے آب شمشیر سے بجھائی گئی اور آتش خانے راکھ ہو کر اڑ گئے۔ افسوس یہ ہے کہ ژند و پازند کے ورق و ورق برباد کئے گئے اور ہزاروں کتابیں فلسفہ الہی اور علوم و فنون کی تھیں کہ نابود ہو گئیں جبکہ یونانیوں نے ملک پر غلبہ پایا تو زبان نے بھی بانوں پر زور دکھایا ہو گا تھوڑے ہی دنوں میں پار تھیا والوں کا عمل دخل ہو گیا وہ ایران جسے ہزاروں برس سے ملک گیر ی کے نشان سلاسی تارتے تھے اور ہندوستان کی اس کے دربار میں سرچھکاتے تھے ۵۵ سو برس تک ظفر یا بوں کے قبضہ میں دبار ہا اور ژند کی کتب مقدسہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کی گئیں۔

سنہء میں پھر تن بے جان میں سانس آیا اور ساسانیوں کی تلوار وینس قدیمی اقبال نے چمک دکھائی۔ ان پادشاہوں نے ملک و مملکت کی قدامت کے ساتھ بچھے ہوئے مذہب کو بھی روشن کیا۔ گرے ہوئے آتش خانوں

کو پھر اٹھایا اور جہاں جہاں سے پرنے اور پریشان اوراق ہاتھ آئے ہسم
 پہنچائے۔ انھیں کی کوششوں کی کمائی تھی جو پھر ساڑھے چار سو برس بعد علم
 اسلام کے آگے قربانی ہوئی۔ اس معاملہ میں ہمیں نیک نیت پارسیوں کا
 شکریہ نہ بھولنا چاہئے کیونکہ باوجود تباہی اور خانہ بربادی کے جو پُرانا
 کاغذ کسی بااعتقاد کے ہاتھ آیا وہ جان کے ساتھ ایمان کو بھی لیتا آیا
 کہ بند رسالت۔ گجرات وغیرہ ملکوں میں آج تک اسی نور سے آشنائی
 روشن ہیں جو کچھ اُن کے پاس ہے وہ اُن تصنیفات کا بقیہ ہے جو
 ساسانیوں کے عہد میں ہوئیں۔ کتب مذکورہ دونوں زبانوں کا لفظی
 اتفاق ہی نہیں ثابت کرتیں بلکہ ان کے اتحاد و اعتقاد پر بھی شہادت
 دیتی ہیں۔ جو چار برن ہندؤں میں ہیں وہی ایران میں تھے۔
 اجرام آسمانی کی عظمت واجب تھی۔ حیوانات بے آزار کا مارنا گناہ عظیم
 تھا۔ تنازع کا مسئلہ دونوں میں یکساں تھا۔ آتش۔ آب۔ خاک۔
 باد۔ ابر۔ بجلی۔ گرد۔ ہوا وغیرہ اشیاء کے لئے ایک ایک دیوتا مانا ہوا
 تھا جس کے انمار عظمت کے لئے خاص خاص طریقے تھے یا دالہی
 کے زمزمے تھے جس کو وہ اپنی اصطلاح میں گاتا تھا۔ کہتے تھے یہ
 وہی لفظ ہے جس کے معنی پر یہاں گیتا کتاب ہے کیونکہ اس میں
 یاد آئی کے گیت ہیں فارسی مروجہ کے چند الفاظ تمثیلاً لکھتے ہوں

کہ سنسکرت سے ملتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی
پتر	پور	بھراتر	برادر	پتر	پدر
انگشت	انگشت	ماتر	مادر	دومہتر	دختر
بھجار	بار	پاؤ	پا	جانو	زالو
کشیا	خاشاک	بھوم	بوم	بھئے	بیم
x	x	کھر	خر	اشو	اسپ

ایرانی بہن پر ایران میں پہلے اسلام کے ہاتھ سے وہ صدمہ گذرا تھا جو کہ میان دو سو برس بعد گذرا اور اُس سے اس کی حیثیت بالکل بدل گئی تھی۔ بہر حال یہاں وہ ایسی حالت کے ساتھ پہنچی کہ عربی اور ترک کی الفاظ اور بہت سی لفظی اور ترکیبی تبدیلیوں کے سبب سے اس کی صورت نہ پہچانی جاتی تھی۔ یہاں جو مسلمان آئے وہ آپس میں وہی رائج الوقت فارسی بولتے تھے اور ہندؤں سے ہندی الفاظ ملا جلا کر گزارہ کر لیتے تھے۔

ادھر سنسکرت تو دیوبانی یعنی زبان آسمانی تھی۔ اس میں ملکشوں

کو دخل کہاں۔ البتہ برج بھاشا نے اس بن بلائے مہمان کو جگہ دی مہم دان
ہندو سالہا سال تک ملکش بھاشا سمجھ کر غیر زبان سے متنفر رہے مگر زبان
کا قانون دھرم اور حکومت کے قانون سے بھی سخت ہے کیونکہ اسے
گھڑی گھڑی اور پل پل کی ضرورتیں مدد دیتی ہیں جو کسی طرح بند
نہیں ہوتیں۔ غرض آٹھ پہر ایک جگہ کار ہنار ہنار ہنار سنالین دین
کرنا تھا۔ لفظوں کے بولے بغیر گزارہ نہ کر سکے۔ دو قوموں کے ارتباط
میں ایسا اختلاط ضرور ہوتا ہے اور اس کے کئی سبب ہیں اول تو یہ
کہ اکثر نئی چیزیں ایسی آتی ہیں جو اپنے نام اپنے ساتھ لاتیں ہیں (۲) اکثر معانی
لیے ہوتے ہیں کہ انھیں اُن ہی کی زبان میں کہیں تو ایک لفظ میں ادا
ہو جاتے ہیں۔ ترجمہ کریں تو ایک فقرہ بنتا ہے پھر بھی نہ وہ مزہ آتا ہے
نہ مطلب کا حق ادا ہوتا ہے۔ اس صورت میں گویا قانون زبان اور
آئین بیان مجبور کرتا ہے کہ یہاں وہی لفظ بولنا چاہئے دوسرا لفظ بولنا
جائز نہیں۔ (۳) جو لوگ اکثر غیر ملکوں میں سفر کرتے ہیں وہ اس
لطف کو جانتے ہیں جبکہ دو غیر زبان والے ایک جگہ رہتے ہیں تو کبھی
کام کالج کی شدت مصروفیت میں کبھی اُسی عالم میں ضروری بات جلدی
کہ دینے کی غرض سے کبھی آسانی سے مطلب سمجھانے کو ایک دوسرے
کے لفظ خواہ مخواہ اس طرح بول جانے پڑتے ہیں کہ بے اُس کے گزارہ

نہیں ہوتا۔ (۴) پھر جب ایک جگہ رہ کر شیر و شکر ہوتے ہیں تو اکثر پیار اور محبت سے کبھی آپس کی دلگی کے لئے ایک دوسرے کے لفظ بول کر جی خوش ہوتا ہے جس طرح دوست کو دوست پیار ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کے لفظ بھی پیار سے معلوم ہوتے ہیں یا یوں سمجھو کہ جس طرح وطن دار اپنے مہمانوں کے رہنے کو جگہ دیتے ہیں اسی طرح ان کی زبان مہمان لفظوں کو جگہ دیتی ہے (۵) بڑی بات یہ ہے کہ فحیابوں کے اقبال کی چمک اُن کی بات بات کو بلکہ لباس۔ دستار۔ رفتار۔ گفتار کو بھی اُسی آب و تاب سے جلوہ دیتی ہے کہ وہی سب کی آنکھوں میں بھلے معلوم ہوتے ہیں اور لوگ اُسے فقط اختیار ہی نہیں کرتے بلکہ اُس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ پھر اُس میں بہت سے فوائد بھی عقلی دلائل سے پیدا کرتے ہیں۔

اُس زمانہ کی عمدہ بعد کی ہندی تصنیفیں آج نہیں ملتیں جن سے وقت بوقت اس کی تبدیلیوں کا حال معلوم ہوا البتہ جب ۱۱۹۳ھ میں شہاب الدین غوری نے اسے پتھور پر فتح پائی تو چند کوی (ایک نامی شاعر) نے پرستھی راج راسا لکھا۔ اُسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ زبان مذکور نے کتنا جلد عربی فارسی کے اثر کو قبول کر لیا۔ ہر صفحہ میں کئی کئی لفظ نظر آتے ہیں ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت میں اُن کی بھی کچھ اور بھاشا تھی مین و تصنیف

مذکور کا دکھاتا ہوں۔

۷۷ پत्र उठि महल प्रिथीराज मंगिआरी हनि वा जीय ।

॥ ६ परवरदिगार पैगाम रदय लाह करीम कैवार सुरतान
जलालदीन जाया सुरतान सहावदीन अलह उपाया मुसलमान
मद निदान भीमदति • इतनी कहैर कहन लागौ पाति शह सैतान
परवर देवारों दीवान छड्या जादवनि बैरं मड्या पलक आलम
अलीई जीवतै बहुआनपोई हजरति-खुदाय वेल आस मरदां
में लसि धवासहाव साईदेयचादर उचाई

इतने मुलक को फरमान पेस कजलचिलासकैलास राहण
धारगपर

५२ पत्रपाय आलि प्रिथीराज बांहदीनि सुलतानिकरि
सलामति हिवार परीअंगुलि सुलितनं ।

۷۰۔ پتر اٹھ مل پر تھی راج منگیاری ہن واجی۔

۷۱۔ پتر پروردگار پر گرام رچہ لاکریم کے باز سلطان جلال الدین جابا
سلطان شہاب الدین اللہ او پایا مسلمان مدندان بھیم دت اتنی کئے
رک بن لاگو پاتی شاہ شیتاں پرورے دیواروں دیبان چھسریو
جادیں بیر منڈیا لھلک عالم آئی ہی دتے تے بانبان کھوئی جبریت
خدا سے بیل اس مردان میں اس دھوا سہاب سائی دئے چادر اچائی۔
اتنے ملک کو فرمان پئیں کبلی بلاس کے لاس روکھننگ کھانگ
۵۲۔ پتر پائے گھالیہ پر تھی راج بانہ دیں سلطان۔ کر سلام

تہ بار پری انگلی سلی تن۔

یہ اگرچہ مختلف جگہ کے ٹکڑے ہیں۔ مطلب ان کا اصل کتاب کے دیکھنے سے کھلتا ہے مگر حروف شناس آدمی بھی اتنا جان سکتا ہے کہ یہ لفظ عربی فارسی کے اس میں موجود ہیں محل۔ پروردگار۔ پیغام (پیام) کریم۔ سرطان (سلطان) بات شاہ (بادشاہ)۔ دیوان۔ خلک (خلق)۔ عالم۔ حیرت (حضرت) ملک۔ پھرماں (فرمان) سلام۔ ترجمہ اور تصنیف کے تجربہ کار جانتے ہیں کہ ان کی عبارت میں کسی زبان کا اصل لفظ جو اپنا مطلب بتا جاتا ہے سطر سطر عبارت میں ترجمہ کریں تو بھی وہ بات حاصل نہیں ہوتی جو مجموعہ خیالات کا اور اُس کے صفات و لوازمات کا اس ایک لفظ سے سننے والے کے سامنے آئینہ ہو جاتا ہے وہ ہماری سطر بھر سے پورا نہیں ہوتا چند اپنی نظم میں سلطان کی جگہ اگر راجہ بلکہ مہاراجہ لکھ دیتا تو بھی جو صفات اور اس کے لوازمات نیک یا بد۔ رحم یا عدل۔ زور یا ظلم یہ لفظ اس کی نظم میں دکھا رہا ہے وہ بات راجہ مہاراجہ سے ممکن نہیں اسی طرح لفظ سلام کہ اُس کے مطلب کا حق ڈنڈوت خواہ پر نام کوئی لفظ ادا نہیں کر سکتا۔ نظیر اس کی آج انگریزی کے سیکڑوں لفظ ہیں اگر ترجمہ کریں تو سطر نہیں بھی پورا مطلب نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک ہندوستانی شخص اپنے دوست

سے کہتا ہے۔ لاٹ صاحب چھ بجے اسٹیشن پر پہنچیں گے پروگرام کے بموجب شہر کی سیر کریں گے۔ ۵ بجے آتا وہیں چل کر تماشہ دیکھیں گے۔ اب خواہ صبح بگڑے مگر جو اصلی لفظ آپ اپنے معنی سننے والے کو سمجھا رہے ہیں کئی کئی سطروں میں ترجمہ کئے جائیں تو بھی حق مطلب بجا نہ لاسکیں گے آخر چند صدی عیسوی میں کہ سکندر لودی کا زمانہ تھا اتنا ہوا کہ اوّل کا بیتہ فارسی پڑھ کر شاہی دفتروں میں داخل ہوئے اور اب ان لفظوں کو ان کی زبانوں پر آنے کا زیادہ موقع ملا۔ رفتہ رفتہ اکبر کے عہد سے کہ مسلمان شیر و شکر ہو گئے۔ یہ نوبت ہوئی کہ اُدھر بادشاہ اور اس کے اعلیٰ درجہ کے اہل دربار نے جبہ اور دستار کے ساتھ ڈاڑھیوں کو خدا حافظ کہا اور جامے پہن کر کھڑکی دار پگڑیاں باندھ بیٹھے ادھر ہندو شرفا بلکہ راجہ مہاراجہ ایرانی لباس پہنے اور فارسی بول کر فخر کرنے لگے بلکہ مرزا کے خطاب کو بڑے شوق سے لینے لگے۔

اب جس قدر ممکن ہے عہد بہمد کی زبانوں کے نمونے دکھاتا ہوں۔ امیر خسرو جو کہ ۷۴۱ھ میں فوت ہوئے اُن کی ایک غزل نظم اردو کی تاریخ میں دیکھو جس کا پہلا مصرع ہے ع ز حال مسکین مکن تغافل درائے نینا بنائے بیاں الخ۔ اس سے تمہیں کچھ کچھ حال اس وقت کی زبان کا بھی معلوم ہوگا۔ خالق باری انھیں کے مخلوقات فکر سے ہے۔

باریک میں شخص اس سے بھی بہت سے الفاظ اور فقرے
دیکھ کر یہ نکتے سمجھ سکتے ہیں۔

بیابان اور آوے بھائی بنشیں ماورِ بٹھری مائی
ایک مجرب نسخہ آنکھوں کا دوہروں کی بحر میں کتے ہیں
لودھ پھٹکری مردہ سنگ ہلدی زیرہ ایک ایک ٹنگ
افیون چنا بھر مرچیں چار اُرد برابر تھوتا ڈار
پوست کے پانی پوٹلی کرے تر ت پرینوں کی ہرے
نظم اردو کی تاریخ میں ان کی عمدہ پہیلیاں۔ مکر نیاں۔ دو سخنے۔
اصل میں نے لکھ دئے ہیں اُنھیں دیکھو اور خیال کرو کہ بحر میں دوہروں
کی ہیں مگر فارسیت کس قدر اپنا زور دکھا رہی ہے۔

ہندو شاعروں کے دوہرے برج بھاشا میں ہیں۔ مگر عمدہ بعد
کی زبان کا پتہ بتاتے ہیں۔ چنانچہ سکندر لودھی کے زمانہ میں کبیر شاعر
بنارس کے رہنے والے۔ علم میں اُن پڑھ تھے گرو رام چند کے چیلے
ہو کر ایسے ہوئے کہ خود کبیر پتھیوں کا مرت نکالا۔ تصنیفات اگر جمع ہوں
تو کئی جلدیں ہوں۔ اُن کے دوہروں میں فارسی عربی کے لفظ دیکھو۔
دین گوالیو دنی سے دُنی نہ آو ہاتھ پیر کلھاڑی مار یو گا پھل اپنے ہاتھ
کبیر سریر سرائے کیوں سوئے سکھ پین کوچ نکاڑا سانس کا بابت ہے دن پین

گرونانک صاحب کی تصنیفات بہت کچھ ہیں۔ اگرچہ خاص قطعہ پنجاب کی زبان ہے۔ مگر جس بہتات سے اُن کے کلام میں عربی فارسی کے لفظ ہیں۔ اتنے کسی کلام میں نہیں اور چونکہ سینہٴ فیہ کے بعد فوت ہوئے تو اس سے چار سو برس پہلے کی پنجابی کا نمونہ بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ دوہرا

سانس مانس سب جیو تمہارا تو ہے کھرا پیارا

نانک شاعر اچوکست ہے پتے پر ورو گارا

بلکہ اکثر چینس و فیلفہ عبادت کے طور پر ہیں۔ ان میں الفاظ بگڑے اسی کثرت سے نظر آتے ہیں تب جی کے دو فقرے دیکھو۔

دارن جاؤں ان ایک بار تو سدا سلامت جی نرنکار

مسلمان بھی اس زمانہ میں یہاں کی زبان سے محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ سولہویں صدی عیسوی شیر شاہی ہند میں ملک محمد جائسی ایک شاعر ہوا۔ اُس نے پرمات کی داستان نظم کی۔ اس سے عہد مذکور کی زبان ہی نہیں معلوم ہوتی بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اس ملک میں رہ کر یہاں کی زبان کو کس پیار سے بولنے لگے تھے۔ اُس کی کچھ بھی ہندی رکھی ہے اور ورق کے ورق اُلٹتے چلے جاؤ فارسی عربی کا نام نہیں ملتا مطلب اس کا آج مسلمان بلکہ ہر ایک ہندو بھی

نہیں سمجھتا۔ کتاب مذکور چھپ گئی ہے اور ہر جگہ مل سکتی ہے اسلئے نمونہ نہیں لکھتا
ہمایلوں نے جب گجرات دکن پر فوج کشی کی تو سلطان بہاؤ
دہاں کا بادشاہ تھا اور جانیپاٹھیر کا قلعہ بہت مستحکم تھا کہ سلطان خود بھی
دہاں رہتا تھا اور تمام خزانہ و فرائض وہیں رکھتا تھا۔ محاصرہ کے وقت
رومی خاں میر آتش (باوجودیکہ کمال معتبر اور مصاحب منظور نظر سلطان
کا تھا) ہمایلوں سے مل گیا اور قلعہ (تمام نفائس اموال اور خزانہ جیسا
سمیت) ہمایلوں کے قبضہ میں آیا۔ سلطان بہادر کے پاس ایک طوطا
تھا کہ آدمی کی طرح باتیں کرتا تھا اور سمجھ کر بات کا جواب دیتا تھا۔
سلطان اُسے ایسا چاہتا تھا کہ سونے کے پیڑے میں رکھتا تھا اور
ایک دم جدا کرتا تھا۔ وہ بھی لوٹ میں آیا جب دربار میں لائے تو
رومی خاں بھی موجود تھا۔ طوطے نے دیکھ کر پہچانا اور کہا بھٹ پانی رومی خاں
نمک حرام۔ سب کو تعجب ہوا۔ اور ہمایلوں نے کہا رومی خاں چکنم کہ جانور
ورنہ زبانش سے بریدم۔ اس نے شرما کر آنکھیں نیچے کر لیں۔ غرض اس
نقل سے یہ ہے کہ اس وقت بھی لوگوں کی زبان پر عربی فارسی کے لفظ
مزدور چڑھے تھے۔ جب ہی طوطے کی زبان سے نمک حرام کا لفظ نکلا جانور
تھا جو سنتا ہوگا وہی بولتا ہوگا۔ سترھویں صدی عیسوی میں بابائلسی اس
برہمن ضلع باندے کے رہنے والے کہ پنڈت بھی تھے اور شاعر بھی

تھے ہفتیر بھی تھے۔ انہوں نے راماین کو بھاشا میں اس طرح ترجمہ کیا کہ وہ لاثانی کتاب مطبوع خاص و عام ہوتی۔ ان کے دوہروں میں بہت اور کتاب مذکور میں کہیں کہیں لفظ فارسی عربی کے موجود

ہیں۔ دوہرہ راماین

منکارے سبک سکل چلے سوامی کچ پلے	گھر تر و تر و پن باگ بڑیاد یو لگائے
گھر بھاس پن ہٹ بولی	کت ہنگ کل بھی کھولی
رام انیک گریب نو ابے	لوک بید بر برو برا بے
گنی گریب گرام ز ناگر	پنڈت موٹے ملیں جاگر
مایا کو مایا ملے کر کرے ہاتھ	تلسی داس گریب کو کوئی نہ پوچھتا

انہیں دنوں میں سور داس جی نے سری کرشن جی کے ذکر سے اپنے کلام کو مقبول خاص و عام کیا ان کی تصنیف میں شاید کوئی شعر ہوگا کہ فارسی عربی لفظ سے خالی ہوگا۔

مایا دھام دھن و نتا باندھیوں ہوں اس ساج یعنی ساز
 سنت سبھی جانت ہوں تو نہ آیو باج یعنی باز
 کھیت بہت کا بے تم تانے سین سنی آواز یعنی آواز
 دیو نہ جات پار اترانی چاہت چڑھن جہانج یعنی بہار
 بیٹھے پار اتار سور کوں مساراج برج راج

بہنیں کرت کمت پر بھوتم سوں سدا گریب نواح یعنی غریب نواح
 خیال کرو کہ جب یہ بزرگان مذاہب اپنے دوہروں میں فارسی
 لفظ بول جاتے تھے تو گفتگو میں عام ہندو لوگ اس سے کچھ
 زیادہ نہ بولتے ہوں گے۔

آخر میں حسن و خوبی برج بھاشا کی راجہ جے سنگھ سوانی کی قدر و
 سے ظاہر ہوئی انھوں نے ایک ایک اشرفی دوہرہ کوئی اور کنواں
 پنڈتوں کو انعام دیکر دہلی اور نواح دہلی میں شوق پھیلایا۔

اس عہد میں مسلمانوں کی زبان کا کیا حال ہو گا؟ ظاہر ہے کہ
 کئی سو برس سے اسلام آیا ہوا تھا۔ جن کے باپ دادا کئی کئی پشت
 یہیں کی خاک سے اُٹھے اور یہیں پیوند زمین ہو گئے۔ انھیں
 آپس کے رشتوں اور معاملات کے سرشتوں سے ضرور یہاں کی
 زبان یعنی برج بھاشا بولنی ہوتی ہو گی۔ تازہ ولایت۔ آدھی اپنی
 آدھی ان کی ملا کر ٹوٹی پھوٹی بولتے ہوں گے۔ ان زمانوں کی کوئی
 نثر تصنیف نہیں۔ وہی امیر خسرو کی ایک غزل اور پہیلیاں اور مکر نیا
 اور گیت پتا بتاتے ہیں کہ سندھ میں یہاں کے مسلمان خاصی
 بھاشا بولتے ہوں گے بلکہ یہی کلام یہ بھی خبر دیتے ہیں کہ مسلمان بھی
 اب یہیں کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے اور اس زبان کو کس

شوق اور محبت سے بولتے تھے۔ شاید بہ نسبت ہندوؤں کے فارسی عربی الفاظ ان کی زبان پر زیادہ آجاتے ہوں گے اور جتنا یہاں رہنا سہنا اور استقلال زیادہ ہوتا گیا اتنا ہی روز بروز فارسی اثر کی نے صنعت اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہو گا رفتہ رفتہ شاہجہاں کے زمانہ میں کہ اقبال تمپوری کا آفتاب عین اوج پر تھا۔ شہر اور شہر پناہ تعمیر ہو کر نئی دلی دار الخلافہ ہوئی۔ بادشاہ اور ارکان دولت زیادہ تر وہاں رہنے لگے۔ اہل سین۔ اہل قلم۔ اہل حرفہ اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اردو بازار لشکر کو کہتے ہیں اردو شاہی اور دربار میں مل جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اردو ہو گیا اسے فقط شاہجہاں کا اقبال کہنا چاہئے کہ یہ زبان خاص و عام میں اردو کی طرف منسوب ہو گئی۔ در نہ جو نظم و نثر کی مثالیں بیان ہوئیں۔ ان سے خیال کو وسوسہ دیکر کہہ سکتے ہو کہ جس وقت سے مسلمانوں کا قدم ہندوستان میں آیا ہو گا اسی وقت سے ان کی زبان نے یہاں کی زبان پر اثر شروع کر دیا ہو گا چند کوئی کلام مل گیا اہیں الفاظ موجود ہیں محمود کے وقت کی نظم یا نثر مل جائے تو اس میں بھی ضرور ہوں گے۔

سیان باب مذکورہ سے بھی ثابت ہوا کہ جو کچھ اس میں

ہوا کسی کی تحریک یا ارادے سے نہیں ہوا بلکہ زبان مذکور کی طبیعت ایسی لمنسا واقع ہوئی ہے کہ ہر زبان سے مل جل جاتی ہے۔ سنسکرت آئی اس سے مل گئی۔ عربی فارسی آئی اس سے بسم اللہ خیر مقدم کیا۔ اب انگریزی الفاظ کو اس طرح جگہ دے رہی ہے گویا اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

اسی زبان کو ریختہ بھی کہتے ہیں کیونکہ مختلف زبانوں نے اُسے ریختہ کیا ہے۔ جیسے دیوار کو اینٹ۔ مٹی۔ پختا۔ سفیدی وغیرہ پختہ کرتے ہیں۔ یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں گری پڑی پریشان چیز چونکہ ہمیں الفاظ پریشان جمع ہیں اس لئے اُسے ریختہ کہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اُس میں عربی۔ فارسی۔ ترکی وغیرہ کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں اور اب انگریزی داخل ہوتی جاتی ہے اور ایک وقت ہو گا کہ عربی فارسی کی طرح انگریزی زبان قابض ہو جائے گی۔ چنانچہ میں ایک خلدانی نواب زادے کی گفتگو لکھتا ہوں۔ جس کی پرورش اور تعلیم گھریلو ہے یعنی نہ عربی نہ فارسی کی لفاظی نے اُس پر رنگ چڑھایا ہے۔ نہ انگریزی نے روغن پھیلا ہے بلکہ دوستانہ بے تکا خانہ باتیں ہیں جو بڑے آکا کی پنشن لینے کل کچری گیا تھا۔ ڈپٹی صاحب کے کمرے کے آگے کچھ قرقی کمال نیلام ہو رہا تھا۔ کمریاں۔ کوٹ اور واسکٹیں نئی تھیں۔ کتہ اور گلاس بھی

ولایت تھے کرسیاں میزیں چقیں باریک خوش رنگ بھیں بیٹے
 کما چلو کوئی ڈھب کی پیز ہو تولے لیں منجھلے آکا بولے جانے بھی دو۔
 جس مال نے مالک سے وفانہ کی ہم سے کیا وفا کرے گا۔ آتے
 ہوئے ریل کی اسٹیشن کے پاس دیکھتا ہوں۔ کھتے مرزا جان چلے
 آتے ہیں۔ شکرم ٹھہرا کر بڑے تپاک سے ملے بڑھاپے نے بیچا ہے
 کارنگ روپ سب کھودیا۔ وہ شکل ہی نہیں۔ وہ صورت ہی نہیں۔
 کیسے گورے چٹے سفید جوان تھے۔ لوگ تصویریں اترواتے تھے
 میں نے کہا میاں! ہم نے تو جانا تھا تم دھن سے خوب چاق۔
 چوبند۔ سرخ سفید ہو کر آؤ گے۔ تم تو سوکھ کر قاق ہو گئے۔ غضب
 کیا اگلا جو بن بھی گنوا آئے۔ ٹھنڈا سانس بھر کر بولے ہاں جوتی،
 فارسی۔ عربی کے الفاظ تو ظاہر ہیں مگر خیال کیجئے کہ قرق۔ چق۔
 چاق۔ قاق آکا ترکی ہیں۔ میز۔ نامعلوم نیلام پر کالی ہے۔ کرا۔
 اطالی ہے۔ ڈپٹی۔ ریل۔ اسٹیشن۔ کوٹ۔ واسکٹ۔ کنٹر۔ کلاس۔
 انگریزی ہیں۔ چٹا۔ کھٹا۔ پنجابی ہے مگر اتنا ہے کہ ہم چٹا بغیر گورے
 کے اور اسی طرح چٹکا بغیر بھلے کے نہیں بولتے۔ وہ اکیلا ہی بولتے
 ہیں۔ کھٹا پنجابی میں عام ہے ہم خاص صفت کے ساتھ بولتے
 ہیں بھانڈا پیوڑنا۔ اردو میں کسی بات یا راز کھول دینے کو کہتے ہیں

پنجابی میں باسن کو بھانڈا بھی کہتے ہیں۔ گلا گھونٹنا اُردو میں بولتے ہیں۔
 پنجابی میں کھینچکر باندھنے یا مضبوط پکڑنے کو کہتے ہیں مثلاً گھٹ کر باندھو
 یا گٹ کر پکڑو۔ بھٹنا۔ بھنانا۔ توڑنا اور تڑوانا ہے اور اسی سبب سے
 پنجابی میں روپیہ کے لئے بھی بھنانا کہتے ہیں۔ اُردو میں پہلے معنی
 متروک ہو گئے۔ دوسرے معنی رہے وہ بھی رکوہ کر کے کہ جاؤ روپیہ
 کے تنکے بھنالاؤ اور اس اصلیت کا سراغ یوں لگا کہ فارسی میں روپیہ
 کے لئے خوردہ کردن بولتے ہیں اور اُردو میں کہتے ہیں۔ صبح کو
 روپیہ خوردہ کیا تھا۔ دوپہر دیکھو تو برکت! یعنی سب پیسے اٹھ گئے۔
 کسوٹی۔ گھنسا مراد فرسودہ اُردو میں بالکسر بنے پنجابی میں
 اس طرح بولتے ہیں کہ کاف مفتوح معلوم ہوتا ہے اوزہ کا تلفظ عجیب
 ہے کہ اُنھیں کے لئے کے لئے خاص ہے بہر حال اس سے کسوٹی ٹھننے
 کی ٹیسا) معیار کا نام ہوا اُردو میں بھی لفظ کسوٹی ہو گیا روپ۔ جیلا جن
 گنویا برج بھاشا ہے۔ ان کے علاوہ روزمرہ کی باتوں پر خیال کرو۔
 یوسف۔ ہارون۔ موسیٰ۔ عیسیٰ وغیرہ عبرانی ہیں کیسا۔ فیلسوف
 اصطلاح یونانی ہیں۔ اُردو یعنی ماش تامل ہے نہتھا یعنی خود گجراتی ہے
 بڑا جو کڑھائی میں تلتے ہو۔ تلتا ہے۔ گدام، ملایا کی زبان ہے۔ تما کو
 اصل میں سنسکرت ہے تا مکت کا بجاڑا ہوا ہے۔ بے کٹا ہو تو تا م تیر

کتے ہیں۔

اُردو میں اُسوقت نشر کی کوئی کتاب نہ لکھی گئی۔ جس سے سلسلہٴ تبدیلیوں کا معلوم ہو میر جعفر زٹل کے کلام کو میں محمد شاہی بلکہ اس سے پہلے زمانہ کا نمونہ کتاب گزرٹل کا اعتبار کیا؛ البتہ محمد شاہ کے عہد میں ۱۲۵۰ھ میں فصلی تخلص ایک بزرگ نے وہ مجلس لکھی۔ اس کے دیباچہ میں سبب تالیف لکھتے ہیں اور غالباً یہی نشر اُردو کی پہلی تصنیف ہے پھر دل میں گزرا کہ ایسے کام میں عقل چاہئے کامل۔ اور مدد کو طرف کی ہونے شامل کیونکہ بے تائید ممدی مدد جناب احمدی۔ یہ مشکل صورت پذیر نہ ہوئے اور گو ہر مراد شتہ امید میں نہ آوے کلند کوئی نہیں ہوا اس صنعت کا مخترع اور اب تک ترجمہ فارسی بعبارت ہندی نشر نہیں ہوا مستمع۔ پس اس اندیشہ عمیق میں غوطہ کھایا اور بیابانِ تامل و تدبیر میں گزر شتہ ہوا۔ لیکن راہ مقصود کی نہ پائی ناگاہ نیم عنایت الہی دل افکار پر ابتر از میں آیہ بات آئینہ خاطر منہ میں دکھلائی ۛ

میر کی شہنوی شعلہٴ عشق کے مضمون کو بھی مرزا رفیع نے نشر میں لکھا ہے افسوس کہ اس وقت موجود نہیں اُس کا انداز بالکل یہی ہے لیکن چند فقرے سودا کے ایک دیباچہ سے لکھتا ہوں جو کلیات میں موجود ہیں۔ نشر مرزا رفیع ضمیر منیر پر آئینہ دار ان معنی کے مبرہن ہو کہ

محض عنایت حق تعالیٰ کی ہے جو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہو پس یہ
چند مصرعے کہ از قبیل ریختہ در ریختہ خامہ دوزبان اپنی سے صفحہ کا غذیر
تحریر پائے۔ لازم ہے کہ تحویل سخن سامعہ سجان روزگار کروں۔ تا
زبانی اُن اشخاص کی ہمیشہ مورد تمجین و آفریں رہوں ۵
قیمت قدر شناسا ہی سے پہنچے ہو ہم در نہ دنیا میں خرف بھی نہیں گوہر سو کم
مضمون سینہ میں پیش از مرغ اسیر نہیں کہ ہو بیچ قفس کے جو قوت
زبان پر آیا فریاد بلبل ہے واسطے گوش داورس کے۔ غرض جس اہل
سخن کا در منصفی زینت لب ہے۔ سر رشته معانی کا اس کلام کے اس
انصاف طلب ہے اگر حق تعالیٰ نے صبح کا غنہ سفید کی مانند شام سیاہ
کرنے کو یہ خاک را خلق کیا ہے تو ہر انسان کے فالوس دماغ میں چراغ
ہوش دیا ہے چاہئے کہ دیکھ کر نکتہ چینی کرے ورنہ گزند زہر آلود سے بے
اجل کا ہے کو مرے ۶

اس تصنیف سے تخمیناً ۳۰ برس کے بعد جبکہ میر انشا اللہ خاں اور
مرزا جان جانا منظر کی دلی میں ملاقات ہوئی ہے اُس گفتگو کے چند
فقرے بھی قابل غور ہیں سید انشا مرزا جان جانا سے فرماتے ہیں۔

سید انشا فرماتے ہیں

»ابتداء سے سن صبا سے تا اوّل ریعان اور اوائل ریعان سے
اے آلاں۔ اشتیاق مالا لطاق بقیل عتبہ عالیہ نہ جدے تھا کہ
سلک تحریر و تقریر میں منتظم ہو سکے لہذا بے واسطہ و وسیلہ حاضر
ہوا ہوں۔«

مرزا صاحب جواب میں فرماتے ہیں

»اپنے تئیں کون بھی بد و طفلی سے تمہیں ایسے اشخاص کے ساتھ
موانست اور نجاست رہا کی ہے، لیکن میر غفر غیبی کے نام سے
ایک گفتگو سید انشانے دریائے لطافت میں لکھی ہے اسے پڑھ کر
تعب آتا ہے کہ صاحب کمال نے یہ زبان کس فصاحت کے
قالب میں ڈھالی تھی کہ ان عبارتوں میں عجیب لطف یہ ہے
کہ زبان اردو کی عام فہمی دیکھ کر مذہب نے بھی اپنی برکت کا ہاتھ
اس کے سر پر رکھا یعنی شیخۃ میں مولوی شاہ عبدالقادر نے
قرآن شریف کا ترجمہ اردو میں کیا بعد اس کے مولوی اسماعیل صاحب
نے بعض رسالے عام اہل اسلام کی فہمائش کے لئے اردو میں لکھے۔«

۱۸۳۵ء سے وفات سرکاری بھی اُردو ہونے شروع ہوئے۔
چند سال کے بعد کل دفاتروں میں اُردو زبان ہو گئی۔ اسی سن میں
اخباروں کو آزادی ہوئی۔ ۱۸۳۶ء میں اُردو کا اخبار دلی میں جاری
ہوا اور یہ اس زبان میں پہلا اخبار تھا کہ میرے والد مرحوم کی قلم
سے نکلا۔

غرض اپنی آسانی کے وصف سے اور اس لحاظ سے کہ ملکی
زبان یہی ہے، دفتری زبان بھی یہی ٹھہری اُردو نے آہستہ آہستہ فارسی
کو پیچھے ہٹانا اور اپنا قدم آگے بڑھانا شروع کیا۔ تب سرکار نے مناسبتاً
سمجھا کہ اس ملک کے لوگوں کو انھیں کی زبان میں انگریزی علوم
و فنون سکھائے جائیں چنانچہ ۱۸۳۲ء سے دلی میں سوسائٹی قائم
ہو کر ترجمے ہونے لگے اور ضرورت علمی الفاظ ہم پہنچانے لگی۔
خیال کرو کہ جس زبان کی فقط اتنی بنیاد ہو وہ زبان کیا اور اس کی
وسعت کا میدان کیا۔ البتہ اب امید کر سکتے ہیں کہ شاید یہ بھی ایک
دن علمی زبانوں کے سلسلہ میں کوئی درجہ پائے۔

اُردو اس قدر جلد جلد رنگ بدل رہی ہے کہ ایک منصف اگر
خود اپنی ایک سنہ کی تصنیف کو دوسرے سن کی تصنیف سے مقابلہ
کرے تو زبان میں فرق پائے گا۔ باوجود اس کے اب تک بھی اس

قابل نہیں کہ ہر قسم کے مضمون خاطر خواہ ادا کر سکے یا ہر علم کی کتاب کو بے تکلف ترجمہ کر دے اس کا سبب یہ ہے کہ اکثر علوم اور ہزاروں مسائل علمی مالک فرنگ میں ایسے نکلے ہیں کہ زمانہ سلف میں بالکل نہ تھے۔ اس واسطے عربی۔ فارسی۔ سنسکرت۔ بھاشا وغیرہ جو کہ اردو کے بزرگ ہیں ان کے خزانے میں بھی اس کے ادائے مطلب کے لئے لفظ نہیں اور اس میں ہم اردو بیچاری کے افلاس پر چند اے تعجب نہیں کر سکتے۔ خصوصاً جبکہ ہندو مسلمان اپنے اپنے بزرگوں کی میراث کو بھی ہاتھ سے کھوئے بیٹھے ہوں اور اس میں زمین و آسمان کا فرق ہے شاید مرزا جان جاناں اور سودا وغیرہ بزرگوں کی تحریر کچھ اور ہوگی تقریر کا اندازہ اور ہوگا۔

بہر حال اس وقت تک انشا پر دازی اور ترقی اور وسعت زبان اردو کی فقط شعر کی زبان پر تھی جن کی تصنیفات غزلیں عاشقانہ اور قصیدے مدحیہ ہوتے تھے اور غرض ان سے فقط اتنی تھی کہ ادا و اہل دول سے انعام لے کر گزارہ کریں۔ یا تفریح طبع۔ یا یہ کہ ہم چشموں میں تحسین و آفریں کا فخر حاصل کریں وہ بھی فقط نظم میں نثر کے حال پر کسی کو اصلاً توجہ نہ تھی کیونکہ کارروائی مطالب ضروری کی سب فارسی میں ہوتی تھیں مگر خدا کی قدرت دیکھو تھوڑے

عرصہ میں کئی قدرتی سامان جمع ہو گئے اور سب سے مقدم سبب اس کی عام فہمی تھی کہ ہر شخص سمجھتا تھا۔ اس لئے لکھنے والوں کو اسی میں واہ واہ لینے کا شوق ہوا میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے چار درویش کا قصہ اردو میں لکھ کر نو طرز مرصع نام رکھ شیخ الدولہ کے عہد میں تصنیف ہوئی۔ ۱۱۹۹ھ نواب آصف الدولہ کے عہد میں ختم ہوئی۔

ادھر تو یہ چونچال لڑکا شعر کے جلسوں میں اور امرا کے درباروں میں اپنی بچپن کی شوخیوں سے سب کے دل بہلا رہا تھا ادھر انا فرنگ جو کہ کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعہ پر دور بین لگائے بیٹھا تھا اُس نے دیکھا۔ نظر باز ٹاڈ گیا کہ لڑکا ہونہار ہے مگر تربیت چاہتا ہے۔ تجویز ہوئی کہ جس ملک پر حکمرانی کرتے ہیں اُس کی زبان سیکھنی واجب ہے چنانچہ ۱۱۹۹ھ میں میر شیر علی افسوس نے باغ اردو اور ۱۲۰۰ھ میں آرائش محفل لکھی۔ میر امن دہلوی نے ۱۲۱۱ھ میں باغ و بہار آراستہ کیا اور انھیں دونوں میں خلاقِ حُسنی کا ترتیب لکھا۔ ساتھ ہی جان گلکرسٹ صاحب نے انگریزی میں قواعد اردو لکھی ۱۲۱۸ھ میں شری اللہ بوجی لال کوی نے پریم ساگر لکھی اور بیتاں پکپسی جو محمد شاہ کے زمانہ میں سنسکرت سے برج بھاشا میں آئی

تھی اب عام فہم اردو میں ہو کر ناگری میں لکھی گئی لیکن اس نقارہ فخر
 کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا کہ میر انشا اللہ خاں پہلے شخص ہیں
 جنہوں نے ^{۱۸۴۲ء} قواعید اردو لکھ کر ایجاد کی تھنی میں
 ظرافت کے پھول کھلائے۔

.....

برج بھاشا عربی اور فارسی زبانوں نے کیا کیا اثر کئے

جب دو صاحب زبان قومیں باہم ملتی ہیں تو ایک کے رنگ و روپ کا دوسرے پر ضرور سایہ پڑتا ہے اگرچہ اس کے اثر-گفتگو لباس و خوراک- نشست و برخاست- مختلف رسوم میں بھی ہوتے ہیں لیکن چونکہ مجھے اس مقام پر زبان سے غرض ہے اس لئے اس میں گفتگو کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم میں آتی ہے تو اپنے ملک کی صد ہا چیزیں ایسی لاتی ہے کہ جو یہاں نہیں تھیں۔ اشیاء مذکورہ کبھی ضروری اور کبھی ایسی باعث آرام ہوتی ہیں کہ انھیں استعمال میں لینا ضروریات زندگی سے نظر آتا ہے اس لئے یہ لوگ انھیں غنیمت سمجھ کر لیتے ہیں اور خوشی کام میں لاتے ہیں ان اشیاء میں سے بہتری چیزیں تو اپنے نام اپنے ساتھ لاتی ہیں اور بہتری نئی ترکیب سے یا اول بدل کر یہاں نیا نام پاتی ہیں اور یہ پہلا اثر دوسری زبان کا ہے اس کے علاوہ جب یہ دونوں ایک جگہ رہ سکر شیر و شکر ہوتی ہیں تو ایک زبان میں دوسری زبان کے لفظ بھی گھل مل جاتے ہیں۔

جب سہان و میزبان ایک دوسرے کی زبان سمجھنے لگتے ہیں تو ایک خوشنما اور مفید تبدیلی کے لئے رستہ پیدا ہوتا ہے کیونکہ اگرچہ طبع انسانی

کے اتحاد سے سب کے خیالات متفق یا قریب قریب ہوں، مگر انداز بیان سب کا جدا جدا ہے اور طبیعت ہمیشہ نئے انداز پسند کرتی ہے اس لئے اداسے مطلب میں ایک دوسرے کے انداز بیان سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پھر نئی نئی تشبیہیں لطیف استعارے لے کر اپنی پُرانی تشبیہوں اور متعل استعاروں کا رنگ بدلتے ہیں اور جس قدر زبان میں طاقت ہے ایک دوسرے کے خیالات اور نئی طرز کو لے کر اپنی زبان میں نیا مزا پیدا کرتے ہیں۔

یہ انقلاب حقیقت میں وقت بوقت ہر ایک زبان پر گذرتا ہے چنانچہ قوم عرب نے جو ایک زمانہ میں۔ روم۔ یونان اور ہسپانیہ وغیرہ سے خلط ملط ہوئی تھی۔ ہزاروں لفظ علمی اور غیر علمی وہاں سے لئے اسی طرح فارسی زبان عربی و ترکی وغیرہ الفاظ سے مالا مال نظر آتی ہے انگریزی کے باب میں مجھے کچھ کہنا زیبائیں۔ کیونکہ اب روشنفکر انگریزی خواں بہت ہیں اور وہ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں مگر اتنا کہنا کافی ہے کہ جس طرح ایک مذہب سلطنت کو تمام موزوں سلطنت کے کارخانے اور ملکی سامان موجود ہونے چاہئیں۔ اسی طرح سب قسم کے الفاظ اور تمام اداسے خیالات کے انداز انگریزی زبان میں موجود ہیں اب مجھے اپنی زبان میں گفتگو کرنی چاہئے لیکن اتنا پھر

یاد دلانا واجب ہے کہ اُردو کہاں سے نکلی ہے اور کیونکر نکلی ہے۔ اُردو زبان اول۔ لین دین نشست برخاست کی ضرورتوں کے لئے پیدا ہو گئی۔ ہندوؤں کے ساتھ ہندی مسلمان جو اکثر ایرانیوں یا ترکستانوں کی اولاد تھی۔ ہندوستان کو وطن اور اس زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ بطرح زمین بے روئیدگی کے نہیں رہ سکتی اسی طرح کوئی زبان بے شاعری کے نہیں رہ سکتی محمد شاہی دور تھا اور عیش و عشرت کی بہار تھی۔ ان شرفاء کو خیال آیا ہو گا کہ بطرح ہمارے بزرگ اپنی فارس کی انشا پردازی میں گلزار کھلاتے تھے۔ اب ہماری یہی زبان ہے ہم بھی اس میں کچھ رنگ دکھائیں چنانچہ وہی فارسی کے خاکے اُردو میں اُتار کر غزلخوئیاں شروع کر دیں اور قصیدے کہنے لگے اور اسمیں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ قوت بیان یا لفظوں کی تراش یا ترکیبوں کی خوبصورتی یا تشبیہ اور استعاروں کی رنگینی غرض اول جو کچھ نصیب ہوا شعرائے اُردو کی بدولت ہوا اور یہی سبب ہے کہ جو کچھ سامان ایک ملکی اور ملکسالی زبان کے لئے درکار ہوتے ہیں اُس سے یہ زبان مفلس ہی کیونکہ اس عہد میں علوم و فنون تاریخ فلسفہ ریاضی وغیرہ کا چرچا عام ہوتا تو اس کے لئے بھی الفاظ ہو جاتے جن جن باتوں کا چرچا تھا اُن ہی سامانوں کے الفاظ اور خیالات پیدا ہوئے

ہاں یہ کننا ضرور چاہئے کہ جو کچھ ہوا تھا اپنے رنگ پر خوب ہوا تھا۔
اب ہمیں پھر مطلب پر آنا چاہئے کہ بھاشا نے اُردو کے کپڑے
پہننے کے لئے فارسی سے کیا کیا لیا۔

۱۔ اُن چیزوں کے نام لئے جو عرب اور فارس سے آئیں اور
اپنے نام اپنے ساتھ لائیں مثلاً لباس میں فرغل۔ لبادہ۔ کرتہ۔ قبا۔
چوغا۔ آستین۔ گریبان۔ پانجامہ۔ ازار۔ عمامہ۔ رومال۔ شال۔ دوشالہ
تکیہ۔ گاؤتکیہ۔ برقع۔ پوستین۔ وغیرہ۔

کھانے کے ذیل میں۔ دسترخوان۔ چپاتی۔ شیرمال۔ باقرخانی
پلاؤ۔ زردہ۔ مزعفر۔ قلیہ۔ قورمہ۔ تنجن۔ فرنی یا قوتی۔ حریرہ۔ حرسیہ۔
نور۔ مرتبے۔ اچار۔ فالودہ۔ کلاب۔ بیدمشک۔ خوان۔ طبق۔ رکابی
تشری۔ کھگیہ۔ نیچہ۔ سینی۔ کشتی۔ چائے جوش وغیرہ۔

متفرقات میں۔ حمام۔ کیسہ۔ سابون۔ شیشہ۔ شمع۔ شمعدان۔
فانوس۔ گلگیر۔ تنور۔ رفیدہ۔ مشک۔ نماز۔ روزہ۔ عید۔ شب برات۔
قاضی۔ ساقی۔ حقہ۔ نیچہ۔ چلم۔ تفنگ۔ بندوق۔ تختہ نزد گنجفہ۔ اور انکی
اصطلاحیں یہ سب چیزیں اپنے نام ساتھ لے کر آئیں۔ بہت سی
چیزیں آئیں کہ بھاشا میں اُن کے نام نہیں سنسکرت کی کتابوں میں
ہوں گے۔ پتہ۔ بادام۔ متقے۔ شتوت۔ میدانہ۔ خوبانی۔ انجیر۔ سیدب۔

بھی۔ ناشپاتی۔ انار وغیرہ۔

۲۔ بہت سے عربی فارسی کے لفظ کثرت استعمال سے اس طرح جگہ پکڑ بیٹھے ہیں کہ اب ان کی جگہ کوئی سنسکرت یا قدیمی بھاشا کا لفظ ڈھونڈ کر لانا پڑتا ہے۔ مگر اس میں یا تو مطلب اصلی فوت ہو جاتا ہے یا زبان ایسی مشکل ہو جاتی ہے کہ عوام تو کیا خواص ہنود کی سمجھ میں نہیں آتی مثلاً دلال۔ فراش۔ مزدور۔ وکیل۔ جلاد۔ صراف۔ مسخرا۔ نصیحت۔ لحاف۔ توشک۔ چادر۔ صورت شکل۔ چہرہ۔ طبیعت۔ مزاج۔ برف۔ فاختہ۔ قمری۔ کبوتر۔ بلبل۔ طوطہ۔ پر۔ دوات۔ قلم۔ سیاہی۔ جلاب۔ رقعہ۔ عینک۔ صندوق۔ کرسی۔ تخت۔ لگام۔ رکاب۔ زین۔ تنگ۔ پوزی۔ لعل۔ کوتل۔ عقیدہ۔ وفا۔ جہاز۔ مستول۔ بادبان۔ تہمت۔ درہ۔ پردہ۔ دالان۔ ترخانہ۔ تنخواہ۔ ملاج۔ تازہ۔ غلط۔ صحیح۔ رسد۔ سرکاری۔ کارگیر۔ ترازو۔ شطرنج کے باب میں تعجب ہے کہ خاص ہند کا ایجاد ہے مگر عرب اور فارس سے جو پھر کر آئی۔ تو سب اجزا کے نام اور اپنی اصطلاحیں بدل آئی۔

سیکڑوں لفظ عربی فارسی کے یہاں آئے مگر ہوا موافق نہ آئی اس لئے مزاج اور صورت بگڑ گئی مثلاً مرغا وغیرہ۔

صرف میں فارسی سے کچھ نہیں لیا۔ خود اتنا کیا کہ قون علامت

جمع ہندی کی عربی فارسی لفظوں پر بھی لگا لیا مثلاً آدمیوں۔ انسانوں۔
دشتوں۔ میووں۔

اسم فاعل۔ فارسی و عربی کے بے شمار لئے اور ان میں شمرنے
باز کے قیاس پر جو پر باز اور وفادار کے قیاس پر طرف دار سمجھدار
سمجھناک بھی بول دیتے ہیں۔ باغبان کے قیاس پر۔ گاڑی بان۔
ہاتھی بان۔ بہل بان۔ مگر بان اور وآن حقیقت میں ایک ہیں
کیونکہ اہل میں دونوں زبانیں ایک دادا کی اولاد ہیں۔ اس کی
تحقیق جیسی کہ چاہئے میں نے فارسی لکچروں میں لکھی ہے۔
اسم ظرف۔ قلمدان وغیرہ کے قیاس پر۔ خاصدان۔ پاندان
ناگردان۔ پیکدان۔ مودی خانہ۔ چخانہ۔

باب حروف۔ کا بھی یہی حال ہے مثلاً حرف تشبیہ کوئی
نہیں لیا مگر۔ چنانچہ اور چونکہ موجود ہیں اور اس طرح آتے ہیں کہ
ترجمہ کے لئے ہندی حرف معلوم ہی نہیں ہوتا۔

حرف شرط میں۔ اگر اور اس سے اگرچہ بھی لیا۔

واو عاطفہ۔ سمیت۔ معطوف اور معطوف علیہ۔ اردو عبارت

میں لے لئے مثلاً آب و ہوا۔ شب و روز۔ صبح و شام۔ روز و شام۔

حرف استثنا۔ میں سے مگر اور عربی کے لفظ سوا۔ ماسوا

الا۔ والا۔ لیکن ولیکن لے لئے اپنے حرفوں کو کم کر دیا۔

حروف ثقی۔ نا اور بنا کی جگہ نہ اور نے آگئے۔

حروف ایجاب رہے مگر اوب کی جگہ میں۔ ست یمن وغیرہ کی جگہ بجا۔ درست۔ واقعی۔ حق۔ بے شک۔ برحق۔ برسر و چشم آگئے۔ اصل زبان کے لفظ نہ رہے۔

حروف تاکید کی جگہ ہرگز۔ زہنا۔ ضرور۔ البتہ آگئے اصل لفظ گم ہو گئے۔

حروف تردید کی جگہ یا۔ خواہ ہیں اصل گم۔

حروف تمنا میں سے کوئی حرف نہیں کاش فارسی کا لفظ۔

حروف ترقی میں بل تو نہیں بولتے مگر بلکہ اپنے موقع پر آتا ہے۔

اسم کی بحث میں اسماء اشارہ میں سے کچھ نہیں لیا مگر

از اجاک۔ با آنکہ۔ با اینکه مرکب ہو کر بہت آتے ہیں۔

موصولات میں سے کچھ نہیں لیا۔ مگر کاف بیانہ اس

طرح آنے لگا کہ بے اُس کے کلام ہی بے مزہ ہو جاتا ہے۔ کیا

ایسا۔ جیسا۔ کی جگہ کس طرح وغیرہ کس وضع وغیرہ۔ کتنا۔ اتنا۔ جتنا

کی جگہ کس قدر وغیرہ بھی بولنے لگے۔

یائے نسبت کی ترکیبوں میں فارسی عربی کے بموجب نسبتی

الفاظ بولنے لگے چنانچہ دلی وال کی جگہ دہلوی بولتے ہیں اسی طرح اور الفاظ میں۔ اور غورتوں میں شیخانی۔ سیدانی۔ اُستانی۔ وغیرہ وغیرہ۔ باوجودیکہ ہندی کے مصدر موجود تھے مگر صدہا مصدر مرکبہ بنائے مثلاً مانا۔ اب کہتے ہیں ہر چند سمجھایا۔ اُس نے منظور نہ کیا۔ کسی عنوان میں قبول نہ کیا یعنی نہ مانا مکرنا۔ اب کہتے ہیں پہلے تو قبول دیا تھا پھر انکار کر گیا یعنی مکر گیا۔ سوچنا اب کہتے ہیں ہر چند کہتا ہوں۔ عقل کام نہیں کرتی۔ پچپانا۔ اپنے کے پر بہت پشیمان ہوا اگر اب کیا ہو سکتا ہے یعنی پچتایا۔

اسی طرح خوش ہونا غصے ہونا۔ خفا ہونا۔ تنگ ہونا۔ وق ہونا۔ غمگین ہونا۔ تماشا دیکھنا۔ سیر کرنی۔ انتظار کرنا۔ راہ دیکھنا یہاں تک کہ بہتیرے مصدر وں کی اصل ہندی گم ہو گئی۔ اس سے بڑھکر یہ کہ عربی فارسی کے مصدر یا مشتقات لے کر ہندی کا اشتقاق کر لیا۔

گزشتن سے گزرتا اور اس کے افعال محاورہ ہے کہ گئی گزری بات کا کیا کہنا۔

فرمودن سے فرمانا اور اُس کے بہت سے افعال۔ قبول سے قبولنا۔ محاورہ ہے بڑا بادی چور تھا ہر گز نہ قبول۔

بدل سے بدلنا اور اس کے بہت سے افعال۔ محاورہ ہے
کہ او لے کا بدلا ہے صاحب !

بخشیدن سے بخشنا۔ لرزیدن سے لرزنا۔

نواختن یا نوازش سے نوازنا۔ شرم سے شرمانا۔

کاہلی سے کھلانا میاں مجبور ایک قدیمی شاعر تھے۔ اُستاد
مرحوم ان کی باتیں کیا کرتے تھے کہ بڑھے دیرینہ سال تھے مکتب میں
پڑھایا کرتے تھے ایک دفعہ مشاعرے میں غزل پڑھی دیکھنا کس
خوبصورتی سے فعل مشتق کو بٹھایا ہے ۵

باتیں دیکھ زمانہ کی جی بات سے بھی کھلاتا ہے

خاطر سے سب یاروں کی مجبور غزل کھلاتا ہے

نحو میں ترکیب اضافی ترکیب توصیفی کہیں مبتدا کہیں خبر ہو کر تمام ہندی
پر چھا گئی۔ اس میں پہلا فائدہ یہ ہوا کہ اختصار کے لحاظ سے
لفظوں کا پھیلاؤ کم ہو گیا۔

دوسرے جمع موصوف ہو تو اسم صفت موصوف کو

بھی اس کے لئے جمع لاتے تھے۔ اب واحد لاتے ہیں ۵

ملائم ہو گئیں دلبر برو کی ساعتیں کڑیاں

پہر کٹنے لگے اُن بن نہ کٹیتن جن بنا گھڑیاں

تیسرے صیفہ مضارع معنی حال۔ سودا

نالہ سینہ سے کرے عزم سفر آخر شب
راہ رو چلنے پہ باندھے ہے کمر آخر شب

چوتھے۔ یہ کہ اقسام اضافہ میں تشبیہ اور استعارہ کے رنگ
سے سیدھی سادی زبان رنگین ہو گئی چنانچہ بھاشا میں کننا ہو تو
کہیں گے راج کنور کے دل کے کنول کی کھلا ہٹ دربار کے
لوگوں سے نہ دیکھی گئی اردو میں کہیں گے شہزادہ کے غنچہ دل
کی کھلا ہٹ اہل دربار سے نہ دیکھی گئی۔

ولی۔ وغیرہ متقدمین کے کلاموں میں ایسی ترکیبیں بہت ہیں
بلکہ آدھے آدھے اور سارے سارے مصرعہ فارسی کے ہیں۔
مگر کچھ اور طرح سے علمی ہذا القیاس بھاشا کے الفاظ اور اس کی
ترکیبیں بھی زیادہ ہیں اور اس طرح ہیں کہ آج لوگوں کو فہم نہیں
معلوم ہوتیں۔ اس کی مثال ایسی ہے گویا دودھ میں مٹھاس ملائی
مگر وہ ابھی اچھی طرح گھلی نہیں۔ ایک گھونٹ خاصہ مٹھا۔ ایک
بالکل پیسا کا ہے پھر ایک میں مصری کی ڈلی دانت تلے آگئی۔ ہاں
اب گھل مل کر وہ مرتبہ حاصل ہوا جسے شیر و شکر کہتے ہیں بعض شیخی
یہ بھی کہتے ہیں کہ خالی بھاشا میں کچھ مزہ نہیں اردو خواہ مخواہ طبیعت

کو بجلی معلوم ہوتی ہے مگر میری عقل دونوں باتوں میں حیران ہے
 کیونکہ جب کوئی کئے آج ایک شخص آیا تھا یا یہ کہیں کہ ایک منش آیا
 تھا۔ تو دونوں یکساں ہیں کیونکہ کہوں کہ منش مخالف طبع ہے ؟ یہ
 بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم بچپن سے شخص سنتے ہیں اس لئے ہمیں
 منش یا مانس نامانوس معلوم ہوتا ہے اسی طرح اور الفاظ جنگی
 تعداد شمار سے باہر ہو گئی ہے اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ بہت
 سے لفظ خود متروک ہیں مگر دوسرے لفظ سے ترکیب پاکر ایسے
 ہو جاتے ہیں کہ فصحا کے محاورہ میں جان ڈالتے ہیں مثلاً یہی مانس
 کہ اکیلا محاورہ میں نہیں مگر سب بولتے ہیں کہ احمد ظاہر میں تو بھلا مانس
 معلوم ہوتا ہے باطن کی خبر نہیں۔

بندھو بھاشا میں بھائی یا دوست کو کہتے ہیں اب بھائی بند
 محاورہ میں کہتے ہیں نہ فقط بندھو نہ بھائی بندھو اور ان استعمالوں
 کی ترجیح کے لئے دلیل کسی کے پاس نہیں جو کچھ زمانہ میں رواج
 ہو گیا۔ وہی فصیح ہو گیا اب ایک زمانہ آئیگا کہ ہمارے محاورہ کو
 لوگ بے محاورہ کہ کر نہیں گے۔

اگرچہ یہ باب بغیر تمثیل دیکھنے کے بھی ہر شخص کے خیال
 میں نقش ہے کہ سنکرت اور برج بھاشا کی مٹی سے اردو کا

پٹلا بنا ہے باقی اور زبانوں کے الفاظ نے خط و خال کا کام کیا ہے
مگر میں چند لفظ مثلاً لکھتا ہوں۔ دیکھو سنسکرت الفاظ جب اُردو
میں آئے تو ان کی اصلیت نے انقلاب زمانہ کے ساتھ کیونکر
صورت بدلی ہے۔

۱۔ چورن سنسکرت ہے یعنی آٹا بھاشا میں چون کتے ہیں
اُردو میں چورن پسی ہوئی دو اکو کتے ہیں اور کٹی ہوئی چیز کے
نیچے جو باریک اجزاء رہ جائیں وہ چورا ہے۔

۲۔ پشٹ سنسکرت ہے بھاشا میں پشان اسی سے ہے
پسناری اُردو میں ہے۔

پیٹھی پسی ہوئی دال کے لئے ہو گئی اور پشیا مصدر ہو گیا۔
۳۔ اٹ جے برج بھاشا اور اُردو دونوں میں آٹا کتے

ہیں۔

۴۔ وارتایا ورت اُردو میں بات ہو گئی۔

۵۔ چتر دھر۔ اُردو میں چودھری ہو گیا۔

۶۔ چندر۔ چاندری سنسکرت ہے اُردو میں چاند اور چاندنی

ہو گئیں۔

۷۔ (گڈھ) گڑھ۔ گھریا خانہ اور کیا عجب ہے کہ

فارسی میں گدیاد کہہ بھی یہی ہو۔

۸۔ ہست ہاتھ ہے۔

۹۔ ہستی کا ہاتھی ہو گیا۔

۱۰۔ بازو۔ سنکرت ہے بھاشا باور اردو بادل یعنی ابر ہو گیا۔

۱۱۔ دل۔ ایک ایک چیز کے دودو ٹکڑے کرنے کو کہتے ہیں بھاشا اور اردو میں دال خال غلہ کے لئے اور دلنا مصدر نکل آیا۔

۱۲۔ کشیر۔ دودھ بھاشا گھیر یا چھیر اردو میں دودھ چاول سے طیار ہوتی ہے۔

۱۳۔ ڈگدھ۔ سنکرت ہے بھاشا دودھ ہوا اب اردو دودھ

کہتے ہیں۔

۱۴۔ ماش یا ماگھ۔ ماس۔ اردو میں مینا ہو گیا۔

۱۵۔ گانڈا۔ اردو میں گتا ہو گیا مگر گنڈیری میں ڈال باقی

رہی۔

بہت سے الفاظ ہیں کہ عربی فارسی نے اردو کو دئے اردو

نے کیس تو لفظوں میں کچھ تصرف کیا۔ معنی وہی رکھے کیس لفظوں کو سلامت رکھا کچھ سے کچھ کر لئے مثلاً۔

فیلسوف۔ یونانی لفظ ہے بمعنی محب الحکمت جسے عربی میں

حکیم اور انگریزی میں ڈاکٹر یا فلوز فرکتے ہیں مگر اُردو والے دغلاباز اور مکار کو کہتے ہیں اور فیلسوفی مکاری۔

ابا۔ اما اب اور اُم سے نکلے ہیں۔

خصم غزنی میں بمعنی مقابل یا دشمن ہے مگر اُردو میں خاوند بمقابل جو رکوکے ہے جس سے زیادہ کوئی دنیا میں عزیز نہیں۔ تماشہ۔ سیر۔ غزنی میں فقط بمعنی رفتار ہے اُردو میں کہتے ہیں چاد باغ کی سیر دیکھ آئیں عجب تماشا ہے۔

اخلاص غزنی میں خالص کرنے کو کہتے ہیں اُردو والے پیار۔ اخلاص۔ محبت ایک معنوں میں بولتے ہیں۔

خیرات غزنی لفظ ہے یعنی نیکیاں۔ اُردو میں خیرات دو صدقہ اُتارو۔

تکرار غزنی میں دوبارہ کہنے یا کام کرنے کو کہتے ہیں اُردو میں نزاع یا جھگڑے کو کہتے ہیں۔

روزگار فارسی میں زمانہ کو کہتے ہیں ہندی میں روزگار نوکری ہے۔

رو مال جن معنوں میں یہاں بولتے ہیں یہ ہیں کا ایجاد ہے۔ فارسی میں رو پاک۔ یادست پاک ہے۔

خیر و صلاح عوام الناس غیر سلا کہتے ہیں یعنی صحت و سلامت۔
 رسد۔ اگرچہ فارسی لفظ معلوم ہوتا ہے مگر اہل فارس
 ان معنوں میں نہیں بولتے۔

بہت الفاظ اس طرح لئے کہ معنوں کے ساتھ ان کی
 صورت بھی بدل دی اگرچہ اکثر ان میں سے عوام الناس بولتے
 ہیں مگر بعض الفاظ خواص کی زبانوں تک بھی پہنچ گئے مثلاً۔
 ارداواہ۔ کہ اصل میں اردا بہ تھا۔ قبور۔ قبروں۔

شروا۔ شور بہ یا شورا بہ۔ پکا وہ۔ پڑا۔ پڑین سے۔
 کھینسا۔ کیسہ۔ طاٹ بافی۔ تار بافی۔

کھکل۔ کاہ گل۔ زرمی کونا۔ زرمی کہنہ۔
 ہمام دستہ۔ ہاون دستہ۔ تار تلا۔ طار تلامنی زرمی کہنہ۔
 ہجاز۔ ہراز۔ تانے تشنہ۔ طعن و تشنیع۔

بک بک جھک جھک زق زق بق بق مردار سنگ۔ مردہ سنگ۔
 تو بہ تنسوا۔ توبہ نصوحا۔ گذرمی۔ گذرمی۔ بازار وقت شام۔
 دسپنا دست پناہ ہیں کی فارسی ہے۔

سہ بندی۔ سپہ بندی۔ نگداشت فوج۔
 تاشہ۔ تاسہ اور تاسک فارسی لفظ ہے۔ غرق۔ غرق۔

افرا تفری۔ یعنی افراط و تفریط۔ اصل میں نہایت بہتات اور نہایت کمی کے معنی میں اب کہتے ہیں عجب افرا تفری پڑ رہی ہے یعنی ہل چل پڑ رہی ہے۔

قلا بچ۔ قلاش یا قلا بچ ترکی میں دونوں ہاتھوں کے درمیان کی وسعت کو کہتے ہیں اس لئے کپڑا ناپنے کا پیمانہ بے یہاں خرگوش یا ہرن وغیرہ جانور دوڑتے ہیں تو کہیں گے کہ قلا بچیں بھرتے بھرتے ہیں * * *

آکا۔ ترکی میں بڑے بھائی کو کہتے ہیں یہاں آکا یا دوست کو بولتے ہیں اور اُس میں کچھ بانگین کو بھی دخل ہے قیورق۔ ترکی میں شے محفوظ کو کہتے ہیں یہاں جو شے حاکم کی ضبطی میں آوے اُسے قرق کہتے ہیں۔

مشاطہ۔ مشط عربی میں کنگھی کو کہتے ہیں فارسی میں مشاطہ اس عورت کو کہتے ہیں جو عورتوں کو بناؤ سنگار کر دئے جیسے ہندوستان میں نائین۔ اُردو میں مُشاطہ۔ بضم اول اور تخفیف ثانی اُس عورت کو کہتے ہیں جو زن و مرد کی نسبت تلاش کرے اور شادی کر دے۔

مُرغا۔ فارسی میں مُرغ فقط پرندہ ہے اُردو میں مُرغا

خروس مرغی ماکیاں کو کہتے ہیں۔ ان کے ہاں ہر جمعہ کو مرغوں کی پالی بندھتی ہے۔

بیخ یا چق ترکی میں باریک پردہ کو کہتے ہیں یہاں چلبس کوچک کہتے ہیں۔

کتتا ترکی میں بڑے کو کہتے ہیں یہاں کٹا موٹے کو کہتے ہیں بٹا کٹا محاورہ ہے۔

نظر۔ بالتحریک ہے۔ مگر جمع اس کی بسکون اوسط ہی بولتے ہیں وزیر

ترجمی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو

کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

خطا۔ مشدد ہے مگر اب کہتے ہیں۔ آج کل خطوں میں آداب

والقاب کا دستور ہی نہیں رہا۔ x x x

عُمر بھی عربی میں مشدد ہے فارسی اور اُردو میں بالتغییف بولتے ہیں۔

طرح عربی میں بالتسکین ہے اُردو کے اہل محاورہ اور

شاعر بھی بالتحریک باندھتے ہیں۔

محل باشد یہ ہے مگر کہتے ہیں کل بولی بھٹیاری کے

محلوں بسنت ہے * * *

انگریزی زبان بھی اپنی عملداری بڑھاتی چلی آتی ہے ہندو مسلمان بھائیوں کو اُس دن کا انتظار چاہئے کہ وہ عربی فلکی کے لفظ جواب تک ہمارے تمھارے باپ دادا بولتے رہے آئندہ اُن کی جگہ اس کثرت سے انگریزی لفظ نظر آئیں گے کہ عربی فارسی کے لفظ خود جگہ چھوڑ کر بھاگ جائیں گے چند لفظ ایسے بھی دکھانے چاہئیں جو کہ مختلف ممالک یورپ کے ہیں اور اب ہماری زبان میں اس طرح پیوند پا گئے ہیں کہ جوڑ تک نہیں معلوم ہوتا۔

کمرہ - اطالی ہے۔ پادری زبان لاطینی سے آیا ہے۔
 نیلام - پرتگالی ہے وہ لیلام کہتے ہیں۔ لائین۔ لین ٹرن انگریزی ہے
 اسٹامپ - انگریزی ہے۔ بوتل - باتل انگریزی ہے۔
 بسکٹ - ولسکٹ - انگریزی ہے۔ درجن - ڈوزن انگریزی ہے۔
 پنشن - انگریزی ہے۔ بٹن - بٹن انگریزی ہے۔
 بوتام - بوتان فرینچ ہے۔ بگی - انگریزی ہے۔
 پستول - پٹل انگریزی ہے۔ گلاس - انگریزی میں عام شیشہ ہے
 فلائین یا فلائین - فلینل - انگریزی ہے۔ میم میڈم - انگریزی لفظ ہے۔

بابنٹ۔ بابی نٹ۔ ایک جالی کی قسم کا کپڑا۔ اُردلی۔ آرڈرلی
 اسی طرح اسٹیشن۔ ٹکٹ۔ ریل۔ پولس۔ وغیرہ صد ہا لفظ ہیں کہ
 خاص و عام سے بڑھ کر عورتوں کی زبان تک پہنچ گئے ہیں اور جو
 الفاظ دفتروں اور کچہریوں میں صاحب لوگوں کے ملازم بولتے
 ہیں۔ اگر سب لکھے جائیں تو ایک ڈکشنری بن جائے۔

ہر زبان کے فصحا کا قاعدہ ہے کہ اپنی زبان میں تصرفات لطیف
 سے کچھ ایجاد کر کے نئے لفظ اور اصطلاحیں پیدا کرتے ہیں ہماری
 اردو بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں رہی۔ ان اصطلاحوں
 کی بنیاد اگرچہ اتفاقی پڑتی ہے مگر اُن لوگوں کی طبیعت سے ہوتی
 ہے جو علم کے ساتھ فکر عالی۔ طبیعت براق۔ ذہن پر ایجاد اور
 ایجاد دلپذیر رکھتے ہیں۔ اُن ہی کے کلام کو خاص و عام کے دلوں
 میں بھی اثر ہوتا ہے کہ اُن کی بات سب کے دلوں کو بھلی لگتی
 ہے اور اُسے اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً

گھوڑے کا رنگ جسے ہندوستان میں سرنگ اور پنجابی
 پس چنبا۔ یا لکا کہتے ہیں فارسی میں اُسے کرنگ کہتے ہیں اور چونکہ
 بھاشا میں کت علامت بدی اور سُٹ علامت خوبی ہے اس لئے
 اگر نے اس کا نام سرنگ رکھا۔ گھوڑے کی اندھیری کا نام۔

اُجیالی۔ رکھا کہ نیک شگون ہے۔

خاک رو بہ کو حلال خور کا خطاب بھی اُسی ذرہ نواز بادشاہ کا بخشا ہوا ہے۔

جہانگیر کی رنگیلی طبیعت نے شراب کا نام رام رنگی رکھا اور اس کو فارسی کے شعرا نے اشعار میں بھی باندھا طالبِ آملیؑ نہ ایم منکرِ مباد ایک میسگویم کہ رام رنگی مانشہ دگر دارد سنگترہ کو اس کی خوبی و خوش رنگی کے سبب سے محمد شاہ نے رنگترہ کہا۔

بہل ہندوستان کا کُلم نام رکھا۔

ہار کے لفظ کو بد شگون سمجھ کر پھل سال کوایا۔

شاہ عالم نے سُرخاب کو بھی گلسرہ کہا مگر اس نے رواج

نہ پایا۔

نواب سعادت علی خاں مرحوم نے ملائی کا نام بالائی رکھا کہ لکھنؤ میں عام اور دلی وغیرہ میں کم رائج ہے۔ مذاقِ سلیم دونوں کے لطف میں امتیاز کر سکتا ہے۔

بھاشا کی ساخت کو دیکھو کہ ہر ایک زبان کے ملاپ کے لئے ملنا ر طبیعت رکھتی ہے نظم و نثر پر غور سے نظر کرو اُس نے اپنے

مہمان کے لئے فقط لفظوں ہی میں جگہ خالی نہیں کی بلکہ بہت سے الفاظ و خیالات جو کہ ملکی خصوصیت عربی فارسی سے رکھتے تھے وہ بھی لے لئے چنانچہ بہادری کا میدان رستم و سام کو دیا حالانکہ یہاں وہ بھیم اور ارجن کا حق تھا سو داکتے ہیں ۵

رستم رہا زمین پہ نہ سام رہ گیا مردوں کا آسمان کے تلے نام بگیا
 رستم سے بھلا کہ تو سر تیغ تلے دھڑے پیارے یہ ہم سے ہو ہر کار و ہر مرد
 حُسن و جمال کے شہستان میں لیلی و شیریں آگئیں اور جب وہ آئیں
 تو رانجھ کی جگہ مجنون و فرہاد کیونکر نہ آتے مجنون و فرہاد کی آنکھوں
 سے گنگا و جنتا تو بہ نہیں سکیں مجبورِ جھوٹے سچوں ہندوستان میں آگئے
 ہماچل اور ہندوستان چل کر کوہِ بیتوں قہر شیریں کوہِ الوند سے
 سر بھوڑتے ہیں مگر جب کوئی خوش طبع چاہتا ہے تو یہیں کے پھول
 سے بھی یہاں کے مکان سجا دیتا ہے اور وہ عجب بہار دیتے ہیں۔
 ایک زبان کے محاورہ کو دوسری زبان میں ترجمہ کرنا جائز
 نہیں مگر ان دونوں زبانوں میں ایسا اتحاد ہو گیا کہ یہ فرق بھی
 اٹھ گیا اور اپنے کار آمد خیالوں کے ادا کرنے کے لئے دلپذیر اور
 دلکش اور پسندیدہ محاورات جو فارسی میں دیکھے انھیں کبھی بجنسہ
 اور کبھی ترجمہ کر کے یا مثلاً برآمدن اور بسر آمدن ہندی میں

اس کا ترجمہ لفظی ڈھونڈیں تو نہیں ہے۔ مگر اہل زبان نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ تفسیر کر لیا اور سودا نے کہا۔ سووا۔

اس دل کی تپ آہ کے کتبہ برقم بجلی کو دم سردی جس کے حذر آئے
افعی کو یہ طاقت ہو کہ اس کبر آئے وہ زلف یہ اپنی اگر لہر پر آئے
در آمدن۔ یعنی گھس آنا۔ سووا

یہاں تک نہ دل زار خلایق ہو کوئی مل کر لہو منہ سے صفِ محشر میں آئے

عرق عرق شدن اور آب شدن ذوق
آگ دھن کی بھی ہو جائے گی پانی پانی جب یہ عامی عرق شرم سو تر جائیں گے
حرف آیدن اور دل خوں شدن

حرف آئے مجھ پہ دیکھے کس کس نام سے اس درد سے عقیق کا دل خوں میں ہیں
سید انشا۔ ع۔ لب وہ کہ لعل کے بھی نگینہ پہ حرف ہے

چشم زدن۔ ذوق

لب پر ترے پسینہ کی بوند عقیق لب چشم زنی کرے ہے سہیل میں کے ساتھ
پیمانہ پر کردن۔ مار ڈالنا۔ سودا

ساتی چمن میں چھوڑ کے مجھ کو کدھر چلا پیمانہ میری عمر کا ظالم تو بھر چلا
دامن افشانہ برخاستن۔ بزار ہو کر اٹھ کھڑے ہوا سودا

کیا اس چمن میں آن کے لیجائیگا کوئی دہن تو میرے سامنے گل جھاڑ کر چلا

ازجامہ بیرون شدن

نکلا پڑے ہو جامے کچھ اندنوں قیب تھوڑے ہی دم دلا سے میں اتنا ابھ چلا
کب صبا آئی ترے کو چہ سواے یا کرتیں جوں حباب لب جو جامہ سی باہر ہوا

اگرچہ ان باتوں پر فصاحت کے اصول عامہ کے بموجب بہت
اعتراض ہوئے مگر احتراز نہ ہوئے کیونکہ بولنے والوں کی نسلیں اور
صلیں اور گھر اور گھرانے فارسی سے شیر و شکر ہو رہے تھے۔ جتنا اسکا
دخل زیادہ ہوتا تھا اتنا ہی مزہ زیادہ ہوتا تھا۔ اور آج دیکھتے ہیں تو
اور ہی رنگ ہے۔ ہمارے قادر الکلام انشا پرداز ترجمے کر کے انگریزی
کے خیالوں کے چربے اُتارتے ہیں اور ایسا ہی چاہئے جہاں اچھا
پھول دیکھا چن لیا اور دستار نہیں تو کوٹ میں زیب گر بیان کر لیا
ہمارے انشا پردازوں نے جب دیکھا کہ فارسی والوں نے اپنی
قادر سخنی کے زور یا ظرافت طبع کے شور سے عربی ترکیبوں کا استعمال
کیا ہے تو اُنھوں نے بھی اپنے پیارے ملک کی زبان کو اس نمک
سے بے لطف نہ چھوڑا۔ سو دافر ماتے ہیں۔ ع

جیسی کتاب کوئی ہو ترا صفا صفا

سید رضی خاں رضی مرحوم نے کیا خوب کہا۔

ع۔ تری وہ مثل ہے کہ اے رضی نہ اے الذی نہ اے الذی ۛ

دونوں زبانوں کے باب تشبیہات میں ایک نکتہ کہ بغیر مجھ سے آگے بڑھا نہیں جاتا۔ یعنی مختلف افراد انسان کے طبائع پر غور کرو کہ ہزاروں کوس پر پڑے ہوں اور مختلف طبیعت کے ملکوں میں ہوں لیکن چونکہ طبیعت انسانی متحد ہے اس لئے دیکھو ان کے خیالات کس قدر ملتے جلتے ہوتے ہیں چنانچہ یہاں بالوں کی تعریف میں ناگوں کے لہرانے اور بھونروں کے اڑنے سے تشبیہ دیتے ہیں فارسی میں بھی زلف کی تشبیہ سانپ کے ساتھ آئی ہے اس لئے اُردو میں سانپ رہے اور بھونرے اُڑ گئے اور اس کی جگہ مُشک۔ بنفشہ۔ سنبل۔ ریحان آگئے جو کبھی یہاں دیکھے بھی نہیں مگر عرب کا سادہ مزاج فصیح اپنے نیچر کا حق ادا کرتا ہے اور زلف کو کوٹلے سے تشبیہ دیتا ہے۔ سانولی رنگت کی تعریف میں شام برن اور سیگھ برن کہتے تھے۔ اُس سے کھلتا رنگ ہوتا تو چنپک برنی کہتے تھے۔ اب سمن رنگ اور سیم رنگ الفاظ حُسن کو بہار دیتے ہیں مگر چند رکھ اور ماہرِ خ مشترک ہے۔ آنکھ کی تعریف میں یہاں مرگ کی آنکھ اور کنول کے پھول اور مولا کی اچیلہ ہٹ سے تشبیہ دیتے تھے۔ اُردو میں آہو چشم ہے مگر مٹولے ہوا ہو گئے اور کنول کی جگہ ساغر لبریز اور زرخشاں

آگئی جو کسی نے یہاں دیکھی بھی نہ تھی بلکہ ترک چشم۔ شمشیر نگاہ سے قتل کرنے لگے۔

رفتار کے لئے بھاشا میں مثنوی اور ہنس کی چال مزب المثل ہے۔ اب ہنس کے ساتھ ہاتھی بھی اڑ گیا فقط کبک درمی۔ شور محشر اور فتنہ قیامت نے آفت برپا کر رکھی ہے۔ بھاشا میں ناک کی تشبیہ طوطہ کی ناک سے تھی۔ اب زنبق کی کلی سے تشبیہ دیتے ہیں ہیں آتش کا شعر ہے۔

توڑنے والے گل زنبق کے ہیں کاٹنے والے چمن کی ناک کے فارسی والوں نے کمر کی نزاکت میں بڑی باریکیاں نکالی ہیں مگر سنسکرت نے بھی اپنی جگہ مبالغہ میں کچھ کمی نہیں کی چنانچہ اس کھول کی تعریف میں ایک شاعر نے کہا۔ گوشے اُن کے کانوں سے جا ملے تھے۔

پہلے یہاں ہوا یا ابریا ہنس کو قاصد کہتے تھے۔ اُنھوں نے نسیم اور صبا کو قاصد رکھا بلکہ نالہ اور آہ اور اشک سے بھی پیغام رسانی کا کام لیا۔ استاد مرحوم کا شعر ہے۔

نالہ ہے اُن سے بیان درد جدائی کرتا کام قاصد کا ہے یہ تیر ہوئی کرتا
ظفر گر نہیں ہے کوئی نامہ بر ^{ظفر} ختم آنسو ہی اپنا روانہ کرد

سودا

قاصد اشک کے خبر کر گیا قتل کوئی دل کا نگر کر گیا
فارسی والے طفل اشک باندھتے تھے۔ اُنھوں نے بھی
اُسے لڑکا بنایا۔ اور دیکھو اُستاد مرحوم نے اس کے لئے دامن
کیا خوب تیار کیا ہے۔ ع

طفل اشک ایسا گرد امان مژگاں چھوڑ کر
اور ظفر نے کما ع۔ کیا ہی شریہ لڑکے یہ اوپر تلے کے ہیں ۛ
اور معروف نے بھی کہا ہے ۛ

ابھی سے نام خدا کرنے قاصدنی نکلا یہ طفل اشک بڑا پاؤ کا بلی نکلا
بیاں کیا کروں اشک کی اتبری کا یہ لڑکا بد اطوار پیدا ہوا ہے
یہ نہ سمجھنا کہ فارسی زبان ہندی میں تصرف حاکمانہ کرتی
رہی۔ نہیں۔ اُسے بھی بیاں کے الفاظ لئے بغیر چارہ نہیں ہوا۔
چنانچہ جو الفاظ فارسی اور سنسکرت کی صلیت میں متفق ہیں ان سے
قطع نظر کر کے کہتا ہوں کہ سلاطین چغتایہ کے دفاتروں میں صدہا
لفظ ہندی کے تھے۔ جو کہ فارسی عبارتوں میں بے تکلف مستعمل
ہوتے تھے اور اب بھی عہد مذکور کی تواتر توں میں موجود ہیں۔
مثلاً جھروکے درشن اور کچھول کٹارہ اور کچھوہ مرقع۔

جہانگیر بادشاہ اپنی توزک میں لکھتا ہے کہ میرا بھائی شاہ مراد کو ہستان فوجپور
سیکری میں پیدا ہوا تھا۔ اسی واسطے میرے والد اسے پہاڑی راجہ
کہا کرتے تھے اور آرام بانو بیگم میری چھوٹی بہن کو بہت پیار کرتے تھے۔
اور اکثر منجھ سے کہتے تھے کہ بابا بھت خاطر من بایں خواہر خود کہ لاؤلہ من
است بعد از من باید بروشنے سلوک کنی کہ من بہ او میکشم۔ ناز و برداشتہ بے لادبی
و شونخی ہاے اور ابگذرانی۔ اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں
بچپن میں اکبر کو شاہ بابا اور جہانگیر کو شاہ بھائی کہا کرتا تھا۔

اسی طرح شعرا نے اپنے تصرفات رنگین کے ساتھ اشعار فارسی کو رونق
دی ہے۔ امیر خسرو چھ سو برس پہلے کہتے ہیں عہد شہتہ چوں در پالکی نیچرخ
کہا را آمدہ اور دہلی کی یاد میں ایک جگہ کہتے ہیں۔

سے دہلی ولے بتان سادہ پگ بستہ و چہرہ کج نہ سادہ

اور سہ نثر میں بادشاہ کے لئے کیا خوب کہا ہے۔ بار جگت گردئی عالم
بر خو گرفتہ۔ بیان مذکورہ بالا سے اجمالاً معلوم ہو گیا کہ اردو کا درخت اگرچہ سنسکرت
اور بھاشا کی زمین میں اُگا مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا ہے البتہ شکل یہ
ہوئی کہ بیدل اور ناصر علی کا زمانہ قریب گزر چکا تھا اور اُن کے متقد باقی
تھے وہ استعارہ اور تشبیہ کے لطف سے مست تھے۔ اس واسطے اردو بھاشا
میں استعارہ و تشبیہ کا رنگ بھی آیا اور بہت تیزی سے آیا۔ یہ رنگ اگر اتنی قدر

آتا کہ جتنا چہرہ پر اُبٹنے کا رنگ یا آنکھوں میں سرمہ تو خوشنمائی اور مینائی دونوں کو مفید تھا مگر افسوس کہ اس کی شدت نے ہمارے قوت بیان کی آنکھوں کو سخت نقصان پہنچایا اور زبان کو خیالی باتوں سے فقط توہمات کا سوانگ بنا دیا نتیجہ یہ ہوا کہ بھاشا اور اردو میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا چاہتا ہوں کہ دونوں کے نمونے آنے سامنے رکھ کر اُن کے فرق دکھاؤں مگر اُس سے پہلے دو تین باتیں خیال میں رکھنی چاہئے۔ اوّل تو شاعرانہ اردو کا نوجوان جس نے فارسی کے دودھ سے پرورش پائی۔ اس کی طبیعت میں بہت سے بلند خیالات اور مبالغہ مضامین کے ساتھ وہ حالات اور ملکی رسمیں اور تاریخی اشارے آگئے جو فارس اور ترکستان سے خاص تعلق رکھتے تھے اور بھاشک کے طبعی مخالف تھے۔ ساتھ اس کے فارسی کی نزاکت اور لطافت طبعی کے سبب سے اردو کے خیالات اکثر ایسے پیچیدہ ہو گئے کہ بچپن سے ہمارے کانوں میں پڑتے اور ذہنوں میں بنتے چلے آتے ہیں۔ اس لئے ہمیں مشکل نہیں معلوم ہوتے۔ اُن پڑھ انجان۔ یا غیر زبان والا انسان سنتا ہے تو منہ دیکھتا رہ جاتا ہے کہ یہ کیا کہا۔ اس لئے اردو پڑھنے والے کو واجب ہے کہ فارسی کی انشا پردازی سے ضرور آگاہی رکھتا ہو۔ فارسی اور اردو کی انشا پردازی میں جو دشواری ہے اور ہندی کی انشائیں آسانی ہے۔ اس میں ایک باریک نکتہ غور کے لایق ہے وہ یہ

ہے کہ بھاشا زبان جس شے کا بیان کرتی ہے اس کی کیفیت ہمیں اُن خط و خال سے سمجھاتی ہے جو خاص اُسی شے کے دیکھنے-سو نگھنے چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس بیان میں اگرچہ مبالغہ کے زور یا جوش و خروش کی دھوم دھما نہیں مگر سننے والے کو جو اصل شے کے دیکھنے سے مزہ آتا وہ سننے سے آجاتا ہے۔ برخلاف شعراء فارس کے کہ یہ جس شے کا ذکر کرتے ہیں صاف اُس کی برائی بھلائی نہیں دکھا دیتے بلکہ اُس کے مشابہ ایک اور شے جسے ہم نے اپنی جگہ اچھایا برا سمجھا ہوا ہے اُس کے لوازمات کو شے اول پر لگا کر اُن کا بیان کرتے ہیں مثلاً پھول کہ نزاکت رنگ اور خوشبو میں معشوق سے مشابہ ہے۔ جب گرمی کی شدت میں معشوق کے حُسن کا اندازہ دکھانا ہو تو کہیں گے کہ مارے گرمی کے پھول کے رُخساروں سے شبِ نیم کا پسینہ ٹپکنے لگا اور اسی رنگ میں شاعر کہتا ہے خواجہ وزیر قزوینی ہوں وہ بلبَل جو کرے بچِ خفا تو ہو کر روح میری کُل عارض میں ہے بو ہو کر یثبیس اور استعارے اگر پاس کے ہوں اور آنکھوں کے سامنے ہوں تو کلام میں نہایت لطافت اور نزاکت پیدا ہوتی ہے لیکن جب دور جا پڑیں اور بہت باریک پڑ جائیں تو دقت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہمارے نازک خیال کسی بادشاہ کے اقبال اور عقل کے لئے اس قدر تعریف پر قناعت نہیں کرتے کہ وہ اقبال میں سکندر یونانی اور عقل میں ارسطو نے ثانی ہے

بلکہ بجائے اس کے کہتے ہیں کہ اگر اُس کا ہمارے عقل۔ اوج اقبال سے
 سایہ ڈالے۔ تو ہر شخص کشور دانش دولت کا سکندر اور ارسطو ہو جائے۔
 بلکہ اگر اس کے سینہ میں لائل عقلی کا دریا جوش مارے تو طبقہ یونان
 کو غرق کر دے۔ اول تو ہما کی یہ صفت خود ایک بے بنیاد فرض ہے اور
 وہ بھی اُسی ملک کے ساتھ خاص ہے۔ اُس پر ایک اقبال کا فلک الافلاک
 تیار کرنا اور اُس پر نقطہ اوج کا دریا فت کرنو کیجئے۔ وہاں اُن کے فرضی
 ہما کا جانا دیکھئے پھر زمین پر اُس خیالی آسمان کے نیچے ایک تدبیر کا یونان
 بسانا دیکھئے۔ پھر اس فرضی ہما کی برکت کا اس قدر عام کرنا دیکھئے جس
 سے دُنیا کے جاہل اس خیالی یونان میں جا کر ارسطو ہو جائیں۔ دوسرے
 فقرے میں اول علماء ہند نے تنور سے طوفان کا نکلنا مانا ہی نہیں ہے
 اُس پر طبقہ یونان کا اپنے فلسفہ کی تہمت میں تباہ ہونا وغیرہ وغیرہ ایسی
 باتیں اور روایات ہیں کہ اگرچہ ہمارے معمولی خیالات ہوں مگر غیر قوم
 بلکہ ہمارے بھی عام لوگ اُس سے بے خبر ہیں۔ اس لئے بے سمجھائے
 نہ سمجھیں گے اور جب بات کو زبان سے کہہ کر سمجھانے کی نوبت آئی تو
 لطف زبان کجا اور یہ نہیں تو تاثیر کجا! مزہ وہی ہے کہ آدھی بات
 کسی آدھی منہ میں ہے اور سننے والا پٹھک اٹھتا۔ تار باجا اور راگ بوجھا۔
 خیالی رنگینیوں اور فرضی لطافتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو باتیں بدیہی ہیں اور

محسوسات میں عیاں ہیں۔ ہمارے تشبیہوں اور استعاروں کے پیچ در پیچ خیالوں میں اگر وہ بھی عالم تصور میں جا پڑتی ہیں۔ کیونکہ خیالات کے ادا کرنے میں ہم اول شیا بے جان کو جاندار بلکہ اکثر انسان فرض کرتے ہیں بعد اس کے جانداروں اور عاقلوں کے لئے جو باتیں مناسب حال ہیں ان بیچاروں پر لگا کر ایسے خیالات پیدا کرتے ہیں جو اکثر ملک عرب یا فارس یا ترکستان کے ساتھ قومی یا مذہبی خصوصیت رکھتی ہیں مثلاً رات کو اہل محبت کے جلسہ میں اول تو ساقی کا آنا واجب ہے۔ اُس کی پیشانی اور رخسارہ سے نور صبح روشن ہے مگر زلف کی شام بھی برابر مشک افشاں ہے۔ صراحی کبھی سرکشی کرتی ہے اسی لئے جگہ خون ہو کر ٹپکتا ہے۔ کبھی جھٹکتی ہے اور خندہ قلقل سے ہنستی ہے۔ کبھی وہی قلقل حق حق ہو کر یاد آبی میں صرف ہوتی ہے۔ مگر پیالہ اپنے کھلے مُنہ سے ہنستا ہے اور اُس کے آگے دامن بھی پھیلاتا ہے۔ فلک تیر حواوٹ کا ترکش اور کمان بکمشا لگائے کھڑا ہے مگر عاشق کا تیر آہ اُس کے سینہ کے پار جاتا ہے۔ پھر بھی صل منوس کی آنکھ نہیں پھوٹتی کہ عاشق کی صبح مراد روشن ہو۔

یہاں کی محفل میں شمع برقع فانوس میں تاج زر سر پر رکھے کھڑی ہے اس لئے پروانہ کا آنا بھی واجب ہے۔ وہ عاشق زار آتے ہی جل کر خاک ہو جاتا ہے چراغ کو ہنساتے ہیں اور شمع کو عاشق

کے غم میں رُلا تے ہیں۔ وہ بادِ فاعشوق کی تپ میں سراپا جلتی ہے اُس کی
چربی گھل گھل کر بہتی ہے مگر پائے استقامت اس کا نہیں ملتا۔ یہاں
تک کہ سفیدہ سحر کی کبھی آکر کا فور دیتا ہے اور کبھی طباشیر شمع کا دل
اس لئے گداز ہے کہ شبِ زندگی کا دامن بہت چھوٹا ہے۔ لیکن صبح
دونوں کے ماتم میں گریباں چاک کرتی ہے عاشقِ بادِ خوار کے
لئے مُرغِ سحر بڑا موزی ہے۔ اُس کے ذبح کو ہمیشہ تیغِ زباں تیز رہتی
ہے۔ بادِ سحر قاصدِ خجستہ گام ہے کہ پیغامِ یار کا بہت جلد لانا اور لے جاتا
ہے۔ اسی عالم میں آفتاب کبھی تو بچہ شمع سے آنکھ ملتا ہے سرِ سبز
مشرق سے نکلتا ہے کبھی فلک کے سبز گھوڑے پر سوار کرن کا تاج
زر نگار سر پر چمکاتا شفق کا پھر برا اُڑاتا آتا ہے کیونکہ اپنے حریفِ شاہِ نجم
کی فوج کو پریشان کر کے فتحیاب آیا ہے۔ انھیں بنیادوں پر جب گلزار
کی شگفتگی یا باغ کی بہار دکھانی ہو تو ایسے خیالات میں دکھائیں گے کہ
شاہِ گل کے کان میں قاصدِ صبا کچھ ایسا افسوں پھونک گیا کہ وہ مار
ہنسی کے فرشِ سبز پر لوٹ گیا۔ طفلِ غنچہ سُکر کر اپنے عاشقِ بلبلی شیدا
کا دل بھاتا ہے۔ کبھی خزاں کا غارت گرا تا ہے تو گل اپنا جام اور غنچہ
اپنی مراحمی لے کر روانہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے باغ میں
بہارِ خود ایک معشوق ہے۔ اُس کا چہرہ چمن ہے۔ گلِ رخسار ہیں۔

سنبل بال ہیں بنفشہ زلف ہیں زگس آنکھیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔
 پھر بہار موسم جوانی ہے۔ درخت جوانان چمن ہیں کہ عروسان
 گلشن سے گلے مل کر خوش ہوتے ہیں شاخیں انگڑائیاں لیتی ہیں
 ناک کا سیہ مست پڑا بیٹتا ہے اطفال نبات وایہ بہار کی گود
 میں پرورش پاتے ہیں خضر سبزہ کی برکت سے نسیم سحری مردہ ہزار سالہ
 میں دم عیسوی کا کام دیتی ہے مگر بلبل زار عشق شاہد گل میں داس
 ہے آب رواں عمر گندان ہے اُس کی موج کی تلوار سے دل کٹے
 جاتے ہیں سرو کے عکس کا اثر دہانگے جاتا ہے شبنم کے آنسو جاری
 ہیں بلبل کبھی خوش ہے کہ گل اُس کا پیارا پاس ہنس رہا ہے کبھی
 افسردہ کہ خزاں کا خوریز اُن سب کو قتل کرے گا۔ یا اُس کے دشمن
 یعنی گلچیں و صیاد اُسے وہاں سے نکالیں گے۔ سرو یا شمشاد کے
 عشق میں قمری کا گیر والباس ہے اُس کے مالہ کا آراد لوں کو چیرتا
 ہے کبھی عاشق زار بھی وہیں آنکلتا ہے۔ وہ بجائے اپنے معشوق
 کے حسرت و غم سے ہم کنار ہے۔ روتا ہے اور قاصد صبا کو
 پیغام دیتا ہے کہ میرے تغافل شعار کو ذرا میرے حال کی خبر
 کر دینا۔

بیان مذکورہ بالا سے معلوم ہوا ہو گا کہ ان میں بہت سی باتیں

ایسی ہیں جو خاص فارس اور ترکستان کے ملکوں سے طبعی اور ذاتی تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ بعض خیالات میں اکثر اُن داستانوں یا قصوں کے اشارے بھی آگئے ہیں جو خاص ملک فارس سے علاقہ رکھتے تھے۔ مثلاً شمشاد۔ زرگس۔ سنبل۔ بنفشہ۔ موئے کمر۔ قدس و وغیرہ کی تشبیہیں۔ لیلیٰ۔ شیریں۔ شمع گل۔ سرو و غیرہ کا حُسن۔ مجنون۔ فرہاد۔ بلبل۔ قمری۔ پردانہ کا عشق۔ فانوس کا برقع۔ غازہ اور گلگونہ۔ مانی و بہزاد کی مصوری رستم و اسفندیار کی بہادری۔ زحل کی نخوت۔ سہیل مین کی رنگ افشانی۔ مشاہیر فارس و یونان اور عرب کے قصے راہ ہفتخاں۔ کوہ الوند۔ کوہ بے ستون۔ جوئے شیر۔ قصر شیریں۔ ججوں۔ سیحوں۔ وغیرہ وغیرہ ہر چند سب معاملات عرب اور فارس سے متعلق ہیں۔ مگر اُردو میں بہت سے خیالات انھیں کی بنیاد پر نظم و نثر میں پیدا ہوتے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ ان خیالات نے اور وہاں کی تشبیہوں نے اس قدر زور پکڑا کہ اُن کے مشابہ جو یہاں کی باتیں تھیں اُنھیں بالکل مٹا دیا۔ البتہ سودا۔ سید انشا کے کلام میں کہیں کہیں اور وہ اپنے موقع پر نہایت لطف دیتے ہیں۔ غرض کہ اب انشا پر دازی ایک پرانی یادداشت اُن تشبیہوں اور استعاروں کی ہے کہ صد ہا سال سے ہمارے بزرگوں کی دست مال ہو کر ہم تک میراث پہنچی ہے۔ ہمارے متاخرین کوئی آفوس لینے کی آرزو ہوئی تو بڑا کمال

یہ ہے کہ کبھی صفت بعد صفت کبھی استعارہ در استعارہ سے اُسے اور تنگ و تنگ کیا گیا جس سے ہوا تو یہ ہوا کہ بہت غور کے بعد فقط ایک وہی نزاکت اور فرضی لطافت پیدا ہو گئی کہ جسے محالات کا مجموعہ کہنا چاہئے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ بجائے اُس کے کہ کلام اُن کا خاص و عام کے دلوں پر تاثیر کرے۔ وہ مستعد لوگوں کی طبع آزمائی کے لئے ایک دقیق معنی اور عوام کے لئے ایک عجیب گورکھ دھند تیار ہو گیا اور جواب اُن کا یہ ہے کہ کوئی سمجھے تو سمجھے جو نہ سمجھیں وہ اپنی جہالت کے حوالے۔

اب اس کے مقابلہ میں دیکھو بھاشا کا انشا پر دوازہ برسات میں اپنا باغ کیونکر لگاتا ہے درختوں کے جھنڈ چھائے ہیں لکھن کے پتے ہیں۔ انگی گہری گہری چھانٹو ہے۔ جامن کی ٹنیاں آم کے پتوں میں کھچری ہو رہی ہیں۔ کھرنی کی ٹنیاں فالے کے درخت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ چاندنی کی بیل کمرک کے درخت پر لپٹی جاتی ہے۔ عشق پیچہ۔ لکروندہ پر چڑھا جاتا ہے اُس کی ٹنیاں لٹکتی ہیں جیسے سانپ لہرا رہے ہیں۔ پھولوں کے گچھے پڑے جھوم رہے ہیں۔ میوے والے زمین کو چوم رہے ہیں۔ نیم کے پتوں کی سبزی اور پھولوں کی سفیدی سہار پر ہے آم کے بور میں اُس کے پھولوں کی مک آتی ہے۔ بھینی بھینی بوہی کو بھاتی ہے۔ جب درختوں کی ٹنیاں ہلتی ہیں۔ مولسری کے پھولوں کا مینہ

برستا ہے۔ پھل پھلاری بو چھار ہو جاتی ہے۔ دھیمی دھیمی ہوا ان کی بوباس
 میں بسی ہوئی روشنیوں پر چلتی ہے۔ ٹہنیاں ایسی ہلتی ہیں جیسے کوئی جو بن
 کی متوالی اٹھیلیاں کرتی چلی جاتی ہے۔ کسی ٹہنی میں بھونرے کی آواز۔
 کسی میں مکھیوں کی بھنبھننا ہٹ الگ ہی سما باندھ رہی ہے۔ پرندوں پر
 پر بول رہے ہیں اور کلول کر رہے ہیں۔ حوض میں چادر اس زور سے
 گرتی ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اُس سے چھوٹی چھوٹی نالیوں
 میں پانی لہراتا جاتا ہے تو عجب بہار دیتا ہے۔ درختوں سے جانور اترتے
 ہیں نہاتے جاتے ہیں۔ آپس میں لڑتے جاتے ہیں پروں کو بھرتے
 ہیں اور اڑ جاتے ہیں۔ چرند زمین پر چو کڑیاں بھرتے پھرتے ہیں ایک
 طرف سے کوئل کی کوک ایک طرف سے کوکلے کی آواز۔ اسی جگہ صٹ
 میں عاشق مصیبت زدہ بھی کہیں اکیلا بیٹھا جی بہلا رہا ہے اور اپنی جدائی
 کے دکھ کو مزے لے لے کر اٹھاتا ہے۔

برسات کا سماں باندھتے ہیں۔ تو کہتے ہیں سامنے سے کالی
 گھٹا جھوم کر اٹھی۔ ابر دھواں دھار ہے۔ بجلی کوندتی چلی آتی
 ہے۔ سیاہی میں سارس اور بنگلوں کی سفید سفید قطاریں بہار
 دکھا رہی ہیں۔ جب بادل کڑکتا ہے اوز بجلی چمکتی ہے تو پرندے
 کبھی دُک کر ٹہنیوں میں چمپ جاتے ہیں۔ کبھی دیواروں سے لگ جاتے

ہیں۔ مَورِ جِدا جھنگارتے ہیں۔ پیسے الگ پکارتے ہیں۔ محبت کا متوالا چیلی
کے جھرمٹ میں آتا ہے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ملک کر پھوڑ بھی پڑنے لگی
ہے مست ہو کر وہیں بیٹھ جاتا ہے اور شعر پڑھنے لگتا ہے۔

جب ایک شہر کی خوبی بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں شام ہوتے ایک
مقام پر پہنچا دیکھتا ہے کہ پہاڑیاں ہری بھری ہیں اور گرد سرسبز میدان
میں بے ہوئے گانوں آباد ہیں۔ پہاڑ کے نیچے ایک دریا میں زلزلہ
رہا ہے۔ جیسے موتی کی آبِ نیچوں بیچ میں شہر آباد۔ جب اُس کے اونچے
اونچے مکانون اور برجوں کا عکس پڑتا ہے تو پانی میں کلیان جگمگ جگمگ
کرتی ہیں اور دوسرا شہر آباد نظر آتا ہے۔ لبِ دریا کے سپیڑ بوٹوں اور
زمین کے سبزے کو برسات نے ہرا کیا ہے کہ دو دھیلیں گاٹیوں اور بکریوں
کا چارہ ہو جائے۔

جب اُدھی رات اور پریشانی کا عالم دکھاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اُدھی رات
ادھر۔ اُدھی رات اُدھر۔ جنگل سنسان۔ اندھیرا بیا بان۔ مرگھٹ میں دُور
دور تک راکھ کے ڈھیر۔ جلے ہوئے لکڑ پڑے۔ کہیں کہیں چپا میں آگ جلتی
ہے بجھوتوں پریتوں کی ڈاؤنی صورتیں اور بھیانک مورتیں ہیں۔ کوئی
تاڑ سا قد۔ لال لال دیدے پھاڑے۔ بے بے دانت نکلے گلے میں
لکھو پڑیوں کا مالا ڈالے کھڑا ہنس رہا ہے۔ کوئی ایک ہاتھی کو اسے نفل

میں لے بھاگا جاتا ہے۔ کوئی ایک کالا ناگ لکڑی کی طرح کھڑا چارہا ہے
 پیچھے غل ہوتا چلا آتا ہے کہ لہجہ لہجہ۔ مارو۔ مارو۔ جانے نہ پائے دم بھر میں
 یہ بھوت پریت غایب ہوتے ہیں۔ غل شور مچتا ہے۔ پھر گھٹ کا
 میدان سنسان ہے۔ پتے ہوا سے کھڑکتے ہیں۔ ہوا کا سناٹا۔ پانی
 کا شور۔ آؤ کی ہوک۔ گیدڑوں کا بولنا اور کتوں کا رونا یہ ایسی وحشت
 ہے کہ پہلے ڈر بھی بھول جاتے ہیں۔

دیکھو یہ دونوں باغ آنے سانے لگے ہیں تم نے مقابلہ کیا، دونوں
 کے رنگ ڈھنگ میں کیا فرق ہے۔ بھاشا کا فصیح استعارہ کی طرف
 بھول کر بھی قدم نہیں رکھتا۔ جو لطف آنکھوں سے دیکھتا ہے اور جن
 خوش آوازیوں کو سنتا ہے یا جن خوشبو یوں کو سونگھتا ہے انھیں کو
 اپنی میٹھی زبان سے بے تکلف۔ بے مبالغہ صاف صاف کہہ دیتا ہے۔
 لیکن یہ نہ سمجھنا کہ ہندوستان میں مبالغہ کا زور تھا ہی نہیں۔
 سنسکرت کا انشا پر دازرا بگڑ چلے تو زمین کے ماتھے پر پہاڑ توری
 کے بل ہو جائیں اور وہاں غار چٹروں سے دانت پینے لگیں۔ ان
 مضامین کو دیکھ کر اول ہمیں وہ عام قاعدہ یاد آتا ہے کہ ہر ملک کی انشا پر
 اپنے جغرافیے اور سرزمین کی صورت حال کی تصویر بلکہ رسم و رواج اور لوگوں
 کی طبیعتوں کا آئینہ ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جو کچھ شاعر یا انشا پر دانگ

پیش نظر ہوتا ہے اُسکی تشبیہوں اور استعاروں کا سامان ہوتا ہے۔
 معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ایران خراسان اور توران کی زمین میں
 بہار کا موسم دلوں کو شگفتہ کرتا ہے۔ یہاں برسات کا موسم دلوں میں
 ذوق و شوق پیدا کرتا ہے وہاں بہار میں بلبل ہزار داستان ہے۔ یہاں
 کوئل اور پیپا ہے۔ برج بھاشا کے انشا پرداز برسات کے لطف اور اُسکی
 کیفیتیں بہت خوب دکھاتے ہیں۔ جہانگیر نے اپنے توڑک میں پیچ کما
 ہے کہ ہندوستان کی برسات۔ ہماری فصل بہار ہے اور کوئل یہاں
 کی بلبل ہے اُس موسم میں عجب لطف سے بولتی ہے اور مستیاں
 کرتی ہے۔ بہار کے موسم کا کچھ لطف یہاں ہے تو بسنت رت کا سما
 ہے۔ جس میں ہولی کے رنگ اڑتے ہیں۔ پچکاریاں چھٹی ہیں۔ گلال
 کے قمقمے چلتے ہیں۔ وہ باتیں ہیں جو فارس والے بہار کے سے پر
 کرتے ہیں۔

بہر حال ہمیں اپنے بزرگوں کی اس صنعت کا شکریہ ہی کرنا چاہیے
 کہ ہندی بھاشا میں جو اضافت کی طوالت۔ کا۔ کے۔ کی۔ سے ادھونتی
 ہے وہ فارسی کی اضافت میں آکر مختصر ہو گئی۔ اس کے علاوہ استعارہ
 و تشبیہ جو بھاشا میں شاید اس سبب سے کم لاتے تھے کہ وہ کتاب یا
 انشا پرداز کی زبان نہ تھی۔ یا اس سبب سے کہ برابر کا اور کے کے

آنے سے کلام بدمزہ ہو جاتا تھا۔ اسی طرح بہت تشبیہ میں بھی لفظوں کے بڑھاوے سے کلام مرتبہ فصاحت سے گر جاتا تھا۔ اب اُنھوں نے فارسی کو اس میں داخل کر کے استعارہ و تشبیہ سے مرقع کر دیا جس سے وہ خیالوں کی نزاکت اور ترکیب کی پختگی اور زور کلام اور تیزی طراری میں بھاشا سے آگے بڑھ گئی اور بہت سے نئے الفاظ اور نئی ترکیبوں نے زبان میں وسعت بھی پیدا کی۔

اس فخر کے ساتھ یہ افسوس پھر بھی دل سے نہیں بھولنا کہ اُنھوں نے ایک قدرتی پھول کو جو اپنی منک سے مکتا اور رنگ سے لکتا تھا مفت ہاتھ سے پھینک دیا وہ کیا ہے؟ کلام کا اثر اور انہماک صلیت ہمارے نازک خیال اور باریک بین لوگ استعاروں اور تشبیہوں کی رنگینی اور مناسبت لفظی کے ذوق و شوق میں خیال سے خیال پیدا کرنے لگے اور اصلی مطلب کے ادا کرنے میں بے پروا ہو گئے۔ انجام اس کا یہ ہوا کہ زبان کا ڈھنگ بدل گیا اور نوبت یہ ہوئی کہ گداگر کوشش کریں تو فارسی کی طرح۔ پتھر قمعہ اور بیٹا بازار یا فسانہ عجائب لکھ سکتے ہیں۔ لیکن ایک ملکی معاملہ یا تاریخی انقلاب اس طرح نہیں بیان کر سکتے جس سے معلوم ہوتا جائے کہ واقعہ مذکور کیونکر ہوا اور کیونکر اختتام کو پہونچا اور اس سے پڑھنے والے کو ثابت ہو جائے کہ روئند

کے وقت کی اور صورت حال معاملہ کی ایسی ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہوا اسی طرح ہو سکتا تھا۔ دوسری صورت ممکن نہ تھی اور یہ تو ناممکن ہے کہ ایک فلسفہ یا حکمت اخلاق کا خیال لکھیں۔ جس کی صفائی کلام لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف لگائے اور اُس کے دلائل جو حق بیان کے پردہ میں برابر جلوہ دیتے جاتے ہیں وہ دلوں سے تصدیق کے اقرار لیتے جائیں اور جس بات سے روکنا یا جس کام پر جھکنا منظور ہو اُس میں پوری پوری اطاعت سننے والوں سے لے سکیں یہ قیامت فقط نازک خیالی نے پیدا کی کہ استعارہ و تشبیہ کے انداز اور مترادف فقرے تکیہ کلام کی طرح ہماری زبانِ قلم پر چڑھ گئے بیشک ہمارے متقدمین اُس کی رنگینی اور نزاکت کو دیکھ کر بھولے مگر نہ سمجھے کہ یہ خیالی رنگ ہمارے اصلی جوہر کو خاک میں ملانے والا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج انگریزی ڈھنگ پر لکھنے میں پائے کے مضامین کے پورا پورا ترجمہ کرنے میں ہم بہت قاصر ہیں۔ نہیں! ہمارا اصلی انشا پر دازی اس سرشت میں قاصر ہے۔

انگریزی تحریر کے عام اصول یہ ہیں کہ جس شے کا حال یا دل کا خیال لکھئے تو اُسے اس طرح ادا کیجئے کہ خود وہ حالت گزرنے سے یا اُس کے مشاہدہ کرنے سے جو خوشی۔ یا غم۔ یا غصہ۔ یا رحم۔ یا

خوف۔ یا جوش دل پر طاری ہوتا۔ یہ بیان وہی عالم اور وہی سماویں
پر چھا دیوے۔

بے شک ہماری طرز بیان اپنی چُست بندش اور قافیوں کے
مسلل کھٹکوں سے کانوں کو اچھی طرح خبر کرتی ہے اپنے رنگین الفاظ
اور نازک مضمون سے خیال میں شوخی کا لطف پیدا کرتی ہے۔ ساتھ
اس کے مبالغہ کلام اور عبارت کی دھوم دھام سے زمین و آسمان کو
ترو بالا کر دیتی ہے۔ مگر اصل مقصود یعنی دلی اثر یا اظہار واقفیت و ہونڈو
توند انہیں چند مضمون ہیں کہ ہماری زبانوں پر بہت رواں ہیں۔ مگر
حقیقت میں ہم ان میں بھی ناکام ہیں مثلاً ہم اگر کسی کے حُسن کی تعریف
کرتے ہیں تو رشک و رِغبت پر ہی پر قناعت نہ کر کے اُسے تپلا نامکنا
و محالات کا بنا دیتے ہیں۔ مگر کسی حسین کا حُسن خدا داد خود ایک عالم
ہے کہ جو کچھ آنکھوں سے دیکھ کر دلوں پر گزر جاتی ہے دل ہی جانتے
ہیں۔ بس اسی کو اس طرح کیوں نہیں ادا کر دیتے کہ سننے والے بھی
کلیجہ پکڑ کے رہ جائیں۔ ایک بلونت جوان کی تعریف کریں گے تو
رستم۔ تہمتن۔ اسفندیار۔ روئیں تن۔ شیر بیشہ دغا۔ ننگ قلزم ہیا وغیرہ
وغیرہ لکھ کر صفحے سیاہ کر دیں گے۔ لیکن اُسکی بلند گردن۔ بھرے ہوئے
ڈنڈر۔ چوڑا سینہ۔ بازوؤں کی گلاوٹ پتلی کر۔ غرض خوشنما بدن اور موزوں

ڈیل ڈول بھی ایک انداز رکھتا ہے اُسکی اپنی دلاوری اور ذاتی بہادری بھی آخر کچھ ہے جس کے کارناموں نے اُسے اپنے عہد میں ممتاز کر رکھا ہے اُسی کو ایک وضع سے کیوں نہیں ادا کر دیتے۔ جسے سن کر مراد خیالوں میں اکڑ۔ مگڑ اور کھلائے ہوئے دلوں میں امنگ پیدا ہو جاے۔

ایک چمن کی تعریف سے کبھی فلک کے سبز باغ اور گلشن انجم کے دل پر داغ دیں گے۔ کہیں اُسے فردوس بریں اور جناتِ روئے ہیں بنائیں گے۔ بلکہ ایک ایک پھول اور ایک ایک پتے کی تعریف میں رنگ رنگ سے ورق سیاہ کر دیں گے مگر اُسکی ہریا دل کا لہلہانا۔ پھولوں کا چھپانا۔ میٹھی میٹھی خوشبوؤں کا آنا۔ آبِ رواں کا لہلہانا۔ موزوں درختوں، گلزار کے تختوں کی بہار۔ ہوا کی نمک اور طوطی کی چمک پیسے کی کوک۔ کوئل کی ہوک۔ جو کہ روحانی تفریح کے ساتھ انسان کے دل پر اثر کرتی ہے اُسکا بیان اسطر نہیں کرتے جسکے پڑھنے سے آنکھوں میں سما چھا جائے میدان جنگ ہو تو زمین کے طبقوں کو اڑا کر آسمان میں تلیٹ کر دیتے ہیں اور خون کے دریا ملکوں سے ملکوں میں بہا دیتے ہیں۔ مگر اپنے موقع پر وہ تاثیر جس سے ایک بہادر کی بہادری دیکھ کر دلوں میں قوم کی بہادری اور رفیق پر جان نثار کرنے کا ولولہ پیدا ہو۔ وہ نہیں۔

دوسرے کوچہ میں اگر علم کی تعریف پر اُترتے ہیں تو اُس کی برکت

سے پر پیغمبر ملائک۔ فرشتے بنا دیتے ہیں۔ کاش اُسکے عوض میں چند ظاہر کھلے کھلے
 فائدے بیان کر دیں جس سے ہر شخص کے دل میں اُسکا شوق پیدا ہوا اور اچل
 سمجھ جائے کہ اگر بے علم رہوں گا تو خواری و ذلت کی زندگی سے دین دُنیا
 دونوں خراب ہوں گے۔ ہماری تصنیفات میں اُس کا کچھ ذکر ہی نہیں
 اور افسوس کہ اب تک بھی ہم نے اُس پر توجہ نہیں کی۔ انگریزی میں
 بہت خیالات اور مضامین ایسے ہیں کہ ہماری زبان نہیں ادا کر سکتی۔
 یعنی جو لطف اُن کا انگریزی میں ہے وہ اردو میں پورا ادا نہیں ہو سکتا۔
 جو کہ حقیقت میں زبان کی ناطاقتی کا نتیجہ ہے اور یہ اہل زبان کے لئے
 نہایت شرم کا مقام ہے۔

اگر شایستہ قوموں کی انشا پردازی سوال کرے کہ اُردو کی انشائیوں
 اس حالت میں مبتلا رہی؟ تو حاضر جوابی فوراً بول تھے گی کہ قوم کی انشا
 پردازی بموجب اُس کے حالات کے ہوتی ہے اور اُس کے خیالات
 بموجب حالات ملک اور ترتیب ملکی کے ہوتے ہیں جیسے ہندوستان کی
 تعلیم و شایستگی تھی اور بادشاہوں اور امیروں کی قدر دانی تھی۔ ویسی
 ہی انشا پردازی رہی۔ اور خاتمہ کلام اس فقرے پر ہو گا کہ کوئی پرند
 اپنے بازؤں سے بڑھ کر پر نہیں مار سکتا۔ اُس کے بازو فارسی بنسکتے
 بھاشا وغیرہ تھے۔ پھر اُردو بیچاری انگلینڈ۔ یاروم۔ یا یونان کے محلوں

کیونکر جا بیٹھتی۔ مگر حقیقت میں عقدہ اس سوال کا ایک اور گرہ میں بند ہے۔
 وہ یہ ہے کہ ہر ایک شے کی ترقی کسی ملک میں اُسی قدر زیادہ ہوتی ہے جس
 قدر شے مذکور کو سلطنت سے تعلق ہوتا ہے۔ یورپ کے ملکوں میں قدیم
 سے دستور ہے کہ سلطنت کے اندرونی اور بیرونی اور قوم کی ذاتی اور علمی
 لیاقتوں پر منحصر ہوتے تھے اور سلطنت کے کل انتظام اور اُس کے سب
 قسم کے کاروبار اُنھیں کے شمول اور اُنھیں کی عرق ریز تدبیروں سے
 قرار پاتے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اُن کی تجویزوں کی بنیاد علمی اور عقلی
 اور تاریخی تجربہ کے زوروں پر قائم ہوتی تھی۔ پھر لیاقت مذکورہ بھی سیکڑوں
 ہی میں منقسم نہیں بلکہ ہزاروں میں بھیلی ہوئی تھی۔ ان میں جہاں اور
 نہات سلطنت ہیں وہاں ایک یہ بھی تھا کہ ہر امر تنقیح طلب جلسہ عام
 کے اتفاق رائے سے تحریروں اور تقریروں میں فیصلہ ہوتا تھا تو اوہر
 کی دنیا اوہر ہو جاتی تھی پھر جب طرف ثانی اُس کے مقابل میں جواب
 ترکی بہ ترکی دیتا تھا تو مشرق کے آفتاب کو مغرب سے طلوع کر دیتا
 تھا اور اب تک بھی فقط تقریروں اور تحریروں کے زور سے ہزاروں لاکھوں
 آدمیوں کو متفق کر کے ایک رائے سے دوسری رائے پر بھڑکتے ہیں۔
 خیال کرنا چاہئے کہ اُن کے بیان میں کسی طاقت اور زبان میں کیا کیا
 زور ہوں کے برخلاف ہندوستان کے کہ یہاں کی زبان میں اگر ہوئے

تو ایک بادشاہ کی خوش اقبالی میں چند شعرا کے دیوان ہوئے جو فقط تلعج طبع اور دلگی کا سامان ہے۔ کجا زمین کجا آسمان۔ نہ وہ جو ہر پید ہونے کی نے اُس کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا۔

باوجود اس کے اُردو کی خوش اقبالی اور خوش رواجی قابل شک ہے کیونکہ اس کی اہل تو برج بھاشا ہے جو اپنی بہار جوانی میں بھی فقط ایک ضلع میں لین دین کی زبان تھی۔ خود اُردو دلی سے نکلی جس کا چراغ دلی کی بادشاہت کے ساتھ گل ہونا چاہئے تھا۔ پھر بھی لڑ بچوں بیچ ہندوستان میں کھڑے ہو کر آوازیں کہ اس ملک کی زبان کیا ہے۔ جواب میں سنیں گے کہ اُردو اس کے ایک کنارے مثلاً پشاور سے چلو تو اول افغانی ہے۔ الگ اُترے تو پو پھواری کچھ اور ہی کہتے ہیں۔ جہلم تک دا بنے پر کشمیر کا رہا ہے کہ پور دلا۔ لوزولا یعنی ادھر آؤ بائیں پر ملتان کہتا ہے کہ کہتے گمنیا یعنی کہاں چلے۔ آگے بڑھے تو وہ بولی ہے کہ پنجابی خاص اُسی کو کہتے ہیں۔ اس کے بائیں پر پہاڑی ایسی زبان ہے کہ تحریر و تقریر سب سے الگ ہے۔ تلج اُتریں تو پچا کی کمی سے لوگوں کی وضع و لباس میں بھی فرق شروع ہوتا ہے۔ دلی پہونچے تو اور ہی سہ بندھا ہوا ہے۔ میرٹھ سے بڑھے تو علی گڑھ میں بھاشا سے ملا جلا پورب کا انداز شروع ہو گیا۔ کانپور۔ لکھنؤ سے الہا

ایک ہی عالم ہے جنوب کو نہیں تو مارواڑی ہو کر گجراتی اور دکھنی ہو جاتی ہے۔
 پھر ادھر آئے تو آگے بنگالہ ہے اور کلکتہ پہنچ کر تو عالم گوناگوں۔ خلق خدا اور
 ملک خدا ہے۔ جسکا امتیاز حد و انداز سے باہر ہے۔ میرے دوستو تم جانتے ہو
 کہ ہر شے کی اصلیت اور حسن و قبح کے واسطے ایک مقام ایسا ہوتا ہے جیسے کہ
 کے لئے ٹکسال۔ کیا سبب ہے کہ ابتدا میں بان کے لئے دلی ٹکسال تھی؟
 وجہ اسکی یہ ہے کہ وہ دار الخلافہ تھی۔ دربار میں خاندانی امر اور امیر
 خود صاحب علم ہوتے تھے۔ اُن کی مجلسیں اہل علم اور اہل کمال کا مجمع ہوتی
 تھیں۔ جنگی برکت سے طبیعتیں گویا ہر شے کے سلیقے اور شایستگی اور
 لطافت و ظرافت کا قالب ہوتی تھیں۔ اسی واسطے گفتگو۔ لباس۔
 ادب آداب۔ نشست برخاست۔ بلکہ بات بات ایسی سنجیدہ اور پسندیدہ
 ہوتی تھی کہ خواہ مخواہ سب کے دل قبول کرتے تھے۔ ہر شے کے لئے
 ہمیشہ نئی نئی تراش اور نئی نئی اصلاحیں اور ایجاد و اختراع وہاں سے
 ہوتے تھے اور چونکہ دار الخلافہ میں شہر شہر کا آدمی موجود تھا۔ اس لئے
 وہ دلپذیر ایجاد اور اصلاحیں ہر شہر میں جلد عام ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ
 بہادر شاہ سے پہلے تک دلی ہر بات کے لئے سندرہی اور انھیں
 صفتوں سے لکھنؤ نے بھی سدا افتخار حاصل کی۔ لکھنؤ کو دیکھ کر سمجھ لو
 کہ دل پسند ایجادوں اور رنگین باتوں کا ایجاد ہونا کسی شہر کے اینٹ پتھر

کی تاثیر نہیں ہے۔ ہاں شایہ اور رنگین مزاج لوگ جہاں جمع ہونگے اور دلپذیر باتوں کے سامان موجود ہوں گے وہیں سے وہ پھول کھلنے لگیں گے۔ چنانچہ وہی دلی کے لوگ اور اُن کی اولاد تھی کہ جب تباہی سلطنت اور آبادی لکھنؤ کے سبب سے وہاں پہنچے تو چند روز میں ویسی ہی تراشیں وہاں سے نکلتے لگیں لکھنؤ دار السلطنت ہو گیا اور اس کے ضمن میں زبان بھی دلی کی اطاعت سے آزاد ہو گئی۔ اس آزادی کی کی۔ ناسخ۔ آتش۔ ضمیر۔ خلیق وغیرہ اہل کمال نے بنیاد ڈالی اور انہیں دبیر رند۔ خواجہ وزیر اور سرور نے خاتمہ کر دیا۔ اُنھوں نے زبان کو بڑی ترقی دی مگر اکثر اُن میں ایسے ہوئے کہ جنگل کے صاف کرنے کو کھوٹے گمراہ میں دریا کا دھانہ لاڈالا یعنی صفائی زبان کی جگہ لغات کی بوجھار کر دی۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کا ورق بھی زمانہ نے الٹ دیا۔ اب آفتاب ہماری ملکہ آفاق کا نشان ہے جسے حکم نہیں کہ قلم و خط سے باہر حرکت کر سکے۔ ڈاکوں اور ریل گاڑیوں نے پورب سے پچھم تک دوڑ کر بھانت بھانت کا جانور ایک پنجرے میں بند کر دیا۔ دلی برباد۔ لکھنؤ ویران۔ دونوں کے سندی اشخاص کچھ پیوند زمین ہو گئے۔ کچھ در بدر خاک بسز اب جیسے اور شہر ویسے ہی لکھنؤ۔ جیسے چھاؤنیوں کے بازار ویسے ہی دلی۔ بلکہ اُس سے بھی بدتر۔ کوئی

شہر ایسا نہیں رہا جس کے لوگوں کی زبان عموماً سند کے قابل ہو۔ کیونکہ شہر میں ایسے چیدہ اور برگزیدہ اشخاص جن سے کہ وہ شہر قابل سند ہو صرف گنتی کے لوگ ہوتے ہیں اور وہ زمانہ کی صد ہا سالہ محنتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہت مر گئے۔ کوئی بڑھا جیسے خزاں کا مارا پتیا کسی درخت پر باقی ہے۔ اُس بڑھے کی آواز کیٹیوں کے غل اور اخباروں کے نقار خانوں میں سُنانی بھی نہیں دیتی پس اب اگر دلی کی زبان کو سندی سمجھیں تو وہاں کے ہر شخص کی زبان کیونکر سندی ہو سکتی ہے۔ ہوا کا رُخ اور دریا کا سہاؤ نہ کسی کے اختیار میں ہے نہ کسی کو معلوم ہے کہ کدھر پھرے گا۔ اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ زبان کیا رنگ بدلے گی ہم جہاز بے نا خدا ہیں۔ تو کل بخدا کر بیٹھے ہیں۔ زمانہ کے انقلابوں کو رنگ چمن کی تبدیلی سمجھ کر دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں آزاد ۵

قسمت میں جو لکھا تھا سو دیکھا ہے اب تلک
اور آگے دیکھئے ابھی کیا کیا ہے دیکھنا

.....

محمد شاہ کا زمانہ اور نادر شاہ کا آنا

مانخوڑا قصص ہند حصہ دوم

دوشن اختر شاہزادہ اگرچہ قید خانے میں تھا۔ لیکن دُنیا کی آفتوں
 سے محفوظ ہاں کے پہلو میں نچت بیٹھا تھا۔ دفعۃً شاہ اقبال اوج پر
 آیا۔ چند امیروں نے اگر مجرا کیا اور دست بستہ عرض کی کہ تخت حاضر
 ہے۔ چل کر اپنے قدم سے رونق دیجئے۔ شاہزادہ تو لڑکا تھا اور برسوں
 سے قید خانے میں آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ مگر ماں دیکھ رہی تھی
 کہ جو بادشاہ ہوتا ہے وہی تخت کی قربانی ہوتا ہے۔ اس لئے ہاتھ جوڑتی
 پر دے سے نکل آئی کہ برائے خدا مجھے تاج نہیں چاہئے۔ اس یتیم
 کا سر سلامت رہنے دو اور سلطنت سے معاف رکھو۔ امیروں نے
 ہر طرح عہد و پیمان سے اس کی تسفی کی بعد اس کے خود چتر لگا کر
 شاہانہ عظمت سے لے گئے اور تاج مَر پر رکھ کر محمد شاہ بادشاہ غازی
 بنا دیا۔ شاہزادہ یا تو قید خانہ کی کوٹھری میں بند پڑا تھا یا دفعۃً تمام
 ہندوستان کا شہنشاہ ہو گیا۔ اکبری اور جہانگیری دربار میں سارے

امیروں و وزیروں کو سامنے ہاتھ باندھے دیکھا۔ آنکھیں کھل گئیں۔ مگر دل میں حیران تھا کہ یغیب بادشاہت ہے۔ محل سے نکلنا ہے تخت پر آ بیٹھنا ہے۔ تخت سے اٹھنا ہے۔ اندر چلا جانا ہے! معلوم نہیں کہ دربار کیا ہے اور ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ ماں کے سوا کوئی اپنا نظر نہیں آتا تھا۔ جس سے دل کا حال کمے اور کچھ مشورہ کرے۔ وزیر اور سپہ سالار دونوں دربار کے مالک تھے۔ جو چاہتے تھے سو کرتے تھے اور انھیں کبھی بند سارے کاروبار میں پھیلے ہوئے تھے یا تو سب امیر برائے نام تھے۔

محمد شاہ تو لڑکا ہی تھا۔ ماں نے پھر بھی زمانے دیکھے ہوئے تھے۔ وہ سمجھی کہ وزیر اور سپہ سالار کے پنجے سے رہائی ممکن نہیں۔ مگر اتنی بات ہے کہ یہ سید ہیں اور باقی جو دربار کے امیر ہیں اکثر ترک ہیں اور ہر چند وہ بھی بڑے بڑے حوصلے والے ہیں۔ مگر اتفاق وقت سے دب گئے ہیں اور ان دونوں فریقوں کا آپس میں بگاڑ ہے بلکہ مذہب میں بھی اختلاف ہے غرض ماں نے بیٹے کو سمجھایا کہ ترکوں سے چور کر سیدوں کو توڑ دو بات بن جاتی ہے چنانچہ بادشاہ نے بھی اس بات کا خیال شروع کیا۔ ساتھ ہی زور طالع یہ ہوا کہ وزیر اور سپہ سالار کو بعض کاموں کے لئے دربار سے دور ہونا پڑتا تھا۔ کاروبار میں بادشاہ سے گفتگو کرنے کے لئے اور اُمرا کو بھی رستے ملنے لگے۔ اگرچہ ان دونوں کے معتبر آدمی ہر وقت

موجود رہتے تھے مگر بڑی بات یہ ہوئی کہ محمد شاہ ترکی زبان جانتا تھا۔ چنانچہ ان سے اسی زبان میں باتیں کیا کرتا اور اس پردے میں جو نکتے مطلب کے ہوتے وہ بھی ہو جاتے۔ رقیبوں کے آدمی کھڑے دیکھا کرتے نہ کچھ سمجھتے نہ کچھ کہہ سکتے۔ رفتہ رفتہ بادشاہ کی حمایت سے ترکوں نے زور پایا اور ان کے زور سے بادشاہ کی بادشاہت میں زور آیا۔ چنانچہ وزیر اور سپہ سالار مارے گئے اور ان کی قوم کا نام دربار سے مٹ گیا۔ اگرچہ صوبوں میں اب بھی فساد تھے مگر جب دربار غبار سے صاف ہوا تو بادشاہ کی رنگین طبیعت نے اپنا اصلی رنگ دکھانا شروع کیا چنانچہ ملک کا انتظام امیروں اور وزیروں پر چھوڑا اور خود نایاب رنگ۔ شراب کباب سے ایسا عیش کے دربار میں ڈوبا کہ کسی بات کی خبر نہ رہی۔ رعیت بھی ایشیتوں سے امن چین کے ساتھ انعام و اکرام سے مالا مال ہوتی چلی آتی تھی۔ گھر گھر عیش و عشرت سے دن عید رات شب برات ہو گئی۔ ایسی قدر دان اور عالیشان سلطنتوں میں علما و شعرا اور عام اہل کمال کا کیا ٹھکانا تھا۔ ہزاروں آدمی جمع تھے۔ مگر بادشاہ کی طبیعت کو رنگینی پر مائل دیکھ کر سب رنگین ہو گئے۔ موزوں طبع۔ لطیف گو نوجوان اگر مصاحبت میں داخل ہوئے بلکہ پرانے بڑھے سر سے پاؤں تک خضاب ہو گئے۔ اسی عالم میں بادشاہ خود بھی شعر کہتے تھے۔ چنانچہ فارسی کا شعر ہے ۵

بار در بر صبح بر سر فکر بر جایش کنید عاشقان شب ہی رود زنجیر پایش کشید
اور اُردو کا شعر ہے ۵

پیری میں کس طرح کروں سیر جہاں کی دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشاگری کا
عمدۃ الملک نواب امیر خاں ایک قدیم الخدمت اور خاندانی امیر زادہ تھا
کہ دلیرانہ ہمت اور امیرانہ دماغ رکھتا تھا۔ ساتھ اس کے لطیفہ گوئی اور
بزرگ بینی کا یہ عالم تھا کہ پھلچڑی کی طرح منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ خلوت و
دربار میں ایسی گل افشائیاں کرتا تھا کہ تمام دربار لوٹ لوٹ جاتا تھا۔
لطیفہ۔ ایک دن بادشاہ نے پوچھا کہ امیر خاں یہ جو پوت۔ سپوت
کپوت لوگوں میں زبان زد چلے آتے ہیں۔ اب بھی کچھ ان کی اصل ہے؟
عرض کی کہ حضور اسی دربار میں سب موجود ہیں۔ بادشاہ نے کہا کیونکر؟
کہا پوت تو یہی۔ جیسے حضور یعنی سلطان ابن سلطان اور سپوت برہان الملک
کہ محمد امین نام ایک مغل ایران سے آیا۔ یہاں حضور کے تصدق سے
وہ مرتبہ پایا کہ باپ دادا کا فخر ہو گیا اور کپوت یہ خانہ زاد کہ باپ دادا
حضور کے بزرگوں کی جاں نثاری میں علی اہمدوں پر ممتاز رہے اور فدوی
اس حالتیں گرفتار۔

لطیفہ۔ ایک دن امیر خاں حضور میں اپنے بزرگوں کی جاں نثاریاں
اور شاہجہاں اور عالمگیر کی قدردانیاں بیان کر رہا تھا۔ اس میں یہ بھی

کہا کہ میرا باپ کابل میں ظلم تھا اور اپنی عقل و تدبیر سے اس قدر مورد عنایات
تھا کہ کئی مہینوں میں فتح ہوئیں اور عالمگیر نے اُن کی فتح اس کے نام
پر لکھی یہ ننگ خاندان اس حال میں حضور کے سامنے حاضر ہے۔ برہان الملک نے کہا کہ

پس نوح با بدار نبشت خاندانِ نبوتش گم شد

امیر خاں نے کہا کہ دوسرا شعر بھی تو پڑھئے کہ

سگ اصحاب کعبہ روزے چند پے نیکاں گرفت مردم شد

لطیفہ۔ جب امیر خاں صوبہ آباد سے آئے تو بادشاہ نے پوچھا کہ
امیر خاں ہمارے لئے کیا لائے؟ عرض کی کہ دو ہزار احمق۔ بعد اسکے اپنے بادشاہ
سپاہیوں کو جو وہاں سے ساتھ آئے تھے۔ موجودات کے لئے حاضر کیا۔ بادشاہ
نے جب سچیلے جوان اور انکی درویاں اور سامان دیکھے تو بہت خوش ہوئے اور کہا کہ
ان ہی لوگوں کو تم احمق کہتے تھے۔ عرض کی کہ حضور نے میرے پاس خزانہ۔ ملک
فقط زبانی بات پر تین سو کو س چلے آئے یہ احمق نہیں تو اور کون ہیں۔ بادشاہ
نے کہا کہ خیر ان کو اپنی رفاقت میں رکھو۔ تنخواہ حضور سے مجرا ہوا کرے گی۔

عرض ایسے ایسے لوگوں کی صحبتیں تھیں اور عیش و عشرت کے ہجوم تھے
مناجی باغ اور حیات بخش کے باغوں کو سجا کر طلسمات کا نمونہ کر دیا۔ نروں
میں نواٹے پڑے رہتے۔ بادشاہ ان میں بیٹھتے۔ ناچ رنگ کے حلے جتے
اور شراب کے دور چلتے۔ جب برسات آتی ان کے ہاں بہار آتی قطب صفا

کے جنگل بننے سے ہرے بھرے ہو جاتے۔ یہ شہر کو چھوڑ کر وہاں جا رہے تھے۔ حکم تھا کہ ابرسیاہ ہمارا نقیب ہے جب گرجے کی آواز آیا کرے اسی وقت کمربندی ہو جایا کرے۔

تمام املاک ایک ملک اور علاقے پر تعینات تھے مگر بہار و بار کے لطف اٹھانے کو نائب اپنے وہاں چھوڑے اور خود دربار میں چلے آئے۔ ظاہر ہے کہ جہاں اہل دربار ایسے ایسے خیالات میں ہوں وہاں ملک کے انتظام کا کیا ٹھکانا۔ مگر تازہ کئی یہ کھلا کہ وزیر اور سپہ سالار کے توڑنے کے لئے سب نے تجویز کی کہ نظام الملک آصف جاہ کو دکن سے بلانا چاہئے۔ چنانچہ وہ آیا۔ کل کاروبار اس کے سپرد ہو گئے اور ہر مقدمہ اس کی صلاح سے طے ہونے لگا مگر اس دیرینہ سال نے عالمگیر کے عالم دیکھے ہوئے تھے۔ دربار کے رنگ دیکھ کر بہت گھبرایا اور بادشاہ کو صلاحیت پر لانا چاہیہاں کے رنگین مزاج اس سے بھی گھبرائے اور اپنے توڑ جوڑ مارنے لگے۔ لیکن چونکہ آصف جاہ ایک رتے کا شخص تھا۔ ان کے دار اس کے مقابلے کے قابل تو نہ ہوتے تھے۔ البتہ دق کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن بادشاہ نے اسے ملیوس خاص کا خلعت اور وزرات کا عمدہ دیا۔ اہل دربار کو اس کا داغ ہوا چنانچہ توڑ اس کا یہ کیا۔ اسی رات کو ناق کے جلسے میں ایک بھانڈے نے بادشاہ کو بہت خوش کیا۔ یاروں نے اسے بھی ملیوس خاص

کا خلعت دلوایا۔ اس پر بھی اس دل شکستہ نے جو طریقے اور آئین بادشاہی درباروں کے ہیں۔ وہ جاری کرنے شروع کئے۔ خلوت اور جلوت میں بادشاہ کے دقتوں کی تقسیم کی اور کاروبار ملک کے پیش کرنے لگا رنگین مزاجوں نے اُس کی منہسی اڑانی شروع کر دی۔ رینگیلے بادشاہ کو کچھ تو خود یہ کام وبال معلوم ہوتے تھے۔ کچھ امیروں نے بھکایا۔ چنانچہ آصفیہ کی عرض معروض پر بادشاہ کی بھی وہ توجہ نہ رہی۔ ایک امیر نے اپنی جگہ یہ بھی کہا کہ کیسا بندر کی طرح بادشاہ کے سامنے اُچھلتا پھرتا ہے۔ آصفیہ کو بھی دم دم کی خبر لگتی تھی۔ سُن کر کہا کہ اگر یہی حال ہے تو دیکھو گے فصیل قلعہ کے ایک ایک کنگر پہ بندر ناچے گا۔ آخر تنگ ہو کر کسی بہانہ سے اپنے علاقہ پر چلا گیا کہ ایسے مسخروں میں رہ کر وزیر مہندوستان کھلانے سے حیدرآباد کی صوبہ داری بہتر ہے۔ اتفاقاً ان ہی دنوں میں نادر شاہ افغانوں کو ایران سے نکالتا ہوا قندھار تک آیا تھا اور افغان ادھر سے نکل کر تمام کوہستان کابل میں پھیل گئے تھے۔ چونکہ کابل میں دربار دہلی کی طرف سے صوبہ رہتا تھا۔ اس لئے نادر شاہ نے محمد شاہ کے پاس اپنا ایلچی بھیجا کہ تم بھی اپنے صوبے کے نام حکم بھیجو تاکہ دونوں طرف سے دبا کر اس فرے کو قرار واقعی گوشمالی دیں۔ یہاں ان دنوں میں عیش و عشرت کے غل سے آواز تک بھی نہ سُنانی دیتی تھی چنانچہ ایلچی راہ میں مارے گئے

اور کسی نے خبر بھی نہ لی۔ کہتے ہیں کہ آصف جاہ خود تو دکن کو گیا تھا مگر نادر شاہ کو خفیہ ایلمچی بھیج کر سنسکار کیا کہ آپ بے تکلف چلے آئیں۔ یہاں دلی تک میدان صاف ہے۔ چنانچہ چند روز کے بعد نادر شاہ نے ایلمچیوں کی تباہی سُن کر پھر مراسلہ لکھا اور اخیر کو خطوں کی بے جوابی نے خود اسے بھی ہندوستان کی طرف کھینچا مگر یہاں یہ حال تھا کہ عام خبروں کے علاوہ کابل۔ لاہور وغیرہ کے حاکموں کی عرضیاں بھی آتی تھیں اور کوئی خبر نہ ہوئی تھی بلکہ جب لوگ نادر شاہ کے آنے کی خبریں دیتے تو امراء دربار سُن کر خفا ہوتے اور کہتے کہ لوگوں کے گھر بہت بلند ہیں۔ دُور سے نادر شاہ کا لشکر دکھائی دیتا ہے۔ جب تاجپار ہو کر نادر شاہ نے کابل کو آن گھیرا تو وہاں کے حاکم نے نہایت اضطراب سے عرضی لکھی۔ چنانچہ جس وقت خریطہ پہنچا۔ بادشاہ متاب باغ میں عالم آب کا تماشا دیکھ رہے تھے اور سامنے نایب ہو رہا تھا۔ چونکہ اس وقت نہایت سرور کا عالم تھا۔ عرضی کو لے کر گوشہ اسکا شراب میں ڈبویا اور یہ مصرع پڑھا۔ ع ایں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولی

چونکہ آصف جاہ کی انانی اور تجربہ کاری کو اس کے حریف بھی مانتے تھے۔ اس لئے نادر شاہ کی آمد آمد سُن کر اسے بھی دکن سے بلوایا۔ ادھر نادر شاہ نے کابل کو فتح کر کے پھر نامہ لکھا اور اپنا دوسرا ایلمچی جو دربار دہلی میں رکھا ہوا تھا اسے طلب کیا یہاں دربار میں یہ مقدمہ اُلجھ رہا تھا کہ کسی خط

اور کئی اپہچی آئے اور ادھر سے جواب بھی نہیں گیا۔ اب جواب کیا لکھیں تو اس میں انقلاب کیا لکھیں۔ کیونکہ وہ اصل میں نادر قلی ہے۔ کوئی خاندانی بادشاہ نہیں ہے۔ اتنے میں خبر آئی کہ اس کا لشکر اٹک اُتر آیا۔ یہاں بھی کوچ کی تیاریاں ہونے لگیں اور چلتے چلتے دو مہینے میں کرناٹ پہنچے۔ سب نہر کے کنارے برات کی طرح پڑے تھے اور جس طرح لوگ شہر سے عید گاہ کو جاتے ہیں۔ اس طرح آتے تھے اور لشکر میں شامل ہوتے جاتے تھے۔ برہان الملک کا انتظار ہو رہا تھا۔ کیونکہ اسکی فوج توپ خانے کی پشت گرمی سے ان دنوں بہت نامور تھی۔ اتفاقاً جس دن وہ آکر لشکر میں شامل ہوا۔ اس دن نادر شاہ بھی پاس پہنچ گیا تھا اور یہاں کسی کو خبر بھی نہ تھی۔ برہان الملک نے دربار کی بے پروائی کی شکایتیں کر کے کوچ کی تاکید شروع کی۔

اسی دن کچھ گھسیارے کچھ زخمی کچھ بدحواس دوڑے آئے کہ ہم جنگل میں گھاس کھودنے گئے تھے۔ نادری قراؤلوں نے کئی آدمیوں کو گرفتار کر لیا اور ہم نے بھاگ کر اپنے تئیں یہاں پہنچا یا ہے۔ امرانے جمع ہو کر پھر گفتگو شروع کی اتنے میں خبر آئی کہ چند قزلباش نادری

۵۔ تراء چند سرداروں کا مجموعہ ہوتا ہے جو فوج سے لگے بڑھ کر کئی کوس تک گھومتا رہتا ہے

نادر قلی کی فوج اور گرویش کے حالات کی خبر ہے اور موقع پانہاٹ دوست و بد دوستی کر رہا ہے۔

برہان الملک کے ڈیروں پر ہاتھ مار گئے۔ برہان الملک تلوار ٹیک کر اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ صاحب اب کونسی بات باقی ہے۔ جس کا انتظار کیا جائے؟ اسی وقت فوج لے لڑنے کو روانہ ہو اگر خان دوران نے بادشاہ کو اطلاع دی۔ اٹھنوں نے آصف جاہ کو خبر کی۔ آصف جاہ بولا کہ بہر دن باقی ہے۔ برہان الملک کو روکنا چاہئے کیونکہ لشکر ان کا مندریس مارتا ہوا آیا ہے۔ اس وقت بے موقع جرات کرنی مناسب نہیں۔ کل توپ خانہ سامنے رکھ کر اور سب لشکر کو ترتیب دیکر بندوبست سے لڑیں تو مناسب ہے۔ بادشاہ نے یہی بات خان دوران کو کہلا بھیجی۔ خان دوران سنتے ہی بگڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ بڑے حیف کی بات ہے! ایسا جوان مرد سردار آقا کے نمک پر نثار ہونے جائے اور ہم پہلو میں بیٹھ اس کے مرنے کا تماشا دیکھیں چٹانچہ بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ برہان الملک اب مقابلے میں جا پڑے ہوں گے۔ اس لئے واپس بلانا مصلحت نہیں ساتھ ہی خود ہاتھی پر بیٹھ کر فوج کو روانہ ہوا اور آدھ کو س کا فاصلہ دے کر برہان الملک کے پہلو میں فوج جمادی۔

نادر شاہ بھی سنتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور فوج کے تین حصے کر کے ایک اپنے ساتھ رکھ دو کو دونوں کے مقابلے میں ڈالا۔ قزلباشوں نے برابر حملے پر تمل کرنا شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں عیش پروردہ نوچیں

پریشان ہو گئیں۔ بہت سے سردار مارے گئے اور خان دوران زخمی ہو کر میدان سے پھرے۔ یہاں شکست کی ہوا اڑتے ہی خان دوران کے خیمے ڈیرے ٹٹ کر سب کارخانوں کی خاک اڑ گئی تھی۔ اتنا بھی نہ تھا کہ نیم جاں لاشے کو سائے میں رکھیں۔ غرض ایک چوپکیوں سے لیکر اس میں اتار لائے میں بادشاہ کی طرف سے چند خواجہ سرا آئے اور آصف جاہ وغیرہ بھی عیادت کو پہنچے۔ تھوڑی دیر میں اس بیچارے نے ذرا آنکھ کھولی اور آہستہ سے اتنا کہا کہ خیر ہم نے تو اپنا کام کر لیا۔ اب تم جانو اور ہمارا کام جانے لگنا کتنا کہتے ہیں کہ بادشاہ کو نادر کے پاس اور نادر کو شہر میں نہ لے جانا جس طرح ہو سکے اس بلا کو یہیں سے ٹال دینا۔

اُدھر سے برہان الملک اور اس کے چند رفیق میدان میں رہ گئے تھے۔ وہ جو انمرد ہاتھی پر بیٹھا تیر مار رہا تھا کہ قزلباش چاروں طرف سے گھر آئے۔ ایک جوان نیشاپوری اس کا ہموطن گھوڑا اڑا کر پہنچا اور آواز دی کہ اے نڈامین! دیوانہ شدہ۔ یکہ جنگ میکنی و بچہ اعتماد جنگ میکنی؟

برہان الملک نے ہاتھ روک لیا۔ قزلباش نے نیزہ زمین پر گاڑ گھوڑے کی باگ ڈور اس سے باندھ لی اور جھپٹ کر رسا پکڑا ہوج کے اندر جا بیٹھا۔ برہان الملک ایران کے دستوروں سے واقف تھا۔ کسان ہاتھ سے رکھ دی اور اپنے تئیں بچہ تقدیر کے حوالے کیا۔ قزلباش ہاتھی

کو گھیر کر اپنے لشکر میں لے گئے۔ نادر شاہ نے جرم بخشی کر کے عنایت فرمائی اور چونکہ شام ہو گئی تھی۔ فوج لے کر اپنے خیمہ گاہ کی طرف پھرا۔ برہان الملک کو اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھایا۔ چنانچہ اس نے مصلحت آمیز باتیں کر کے نادر شاہ کو اس بات پر راضی کر لیا کہ حضور ایک معقول نذرانہ لیں اور ہمیں سے واپس تشریف لے جائیں۔ نادر شاہ اس بات پر راضی ہو گیا۔ برہان الملک نے ایک عیضے میں یہ سب حال اپنے بادشاہ کو لکھا اور رقعہ آصف جاہ کو بھیجا کہ تم آؤ اور اس امر کا فیصلہ کر دو۔ یہاں سب دریائے حیرت میں غرق بیٹھے تھے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے! اور حیران تھے کہ کیا کرنا چاہئے۔ یہ خبر سنتے ہی خوش ہو گئے۔ محمد شاہ نے فوراً آصف جاہ کو روانہ کیا۔ اس نے برہان الملک کے ذریعے سے نادر کی ملازمت حاصل کی اور بعد گفتگو کے یہ ٹھہرایا کہ دو کروڑ روپیہ نفل بہا لیتے اور ہمیں سے تشریف لے جائیے۔ نادر شاہ نے یہ بات منظور کی اور آصف جاہ عہد و پیمان کر کے وہاں سے رخصت ہوا مگر محمد شاہ کے سامنے جا کر ان کاموں کو اپنی کارگزاری اور دولت خواہی کے لباس میں ظاہر کیا یعنی برہان الملک کی حسن خدمت کو اڑا دیا۔ حضور سے خانہ دور اور میرالامرائی کا خطاب اور خلعت بیش بہا آصف جاہ کو عنایت ہوا۔

برہان الملک کا ذکر بھی کسی نے نہ کیا دوسرے دن محمد شاہ کی ملاقات کی

۵ مصارف جنگ اور خرچ راہ کے روپیے کو نفل بہا یا نعلبندی کا روپیہ کہتے ہیں۔

ٹھہری۔ بادشاہ ادھر سے بڑے توڑک و احتشام کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ادھر
 نادر نے اپنے بیٹے کو استقبال کے لئے بھیجا۔ وہ رستے میں آکر ملا۔ بادشاہ نے
 تخت رواں کو زمین پر رکھوا کر ملاقات کی۔ اس نے فرزندانہ طور سے معاف
 کیا اور ہر کام ہو کر نادر شاہ کے پاس لے گیا۔ نادر شاہ لب فرش تک
 استقبال کو آیا۔ اپنی مسند پر نہایت تعظیم سے بیٹھا یا بعد اس کے برادرانہ اور
 درمندانہ باتیں شروع کیں۔ چائے آئی اس کا دور چلنے لگا۔ نادر شاہ اس
 وقت برک کی قبا۔ اس پر قرآنی یعنی سیاہ پوست بڑے کاغذستان۔ اس پر
 ایک برکی چھپنے بیٹھا تھا۔ سر پر کلا پانچ تھی۔ ادھر محمد شاہ شہنشاہ کا کرتیہ۔
 ڈھلے کی ململ کا جامہ پہنے تھے اور سر پر جو دستار تھی۔ اس سے بھی گھرا
 تھے۔ برابر بٹیکھا ہوتا تھا۔ نادر شاہ سے کہا کہ رخت شما بسیار گرم است۔ برتن
 گرانی نمی کنند؟ نادر شاہ نے آہ سرد بھر کر کہا کہ برادر جان من! ہمیں رخت
 گرم است کہ مارا از ایران تا بہ اینجا رسانید۔ لطافت لباس شماست کہ نگزشت
 از دہلی تا اینجا حرکت کنید۔ غرض بادشاہ نے ہنسی خوشی یہاں سے مراجعت
 کی۔ برہان الملک و ہاں امیر الامرائی کے منصب کو اپنا حق سمجھے بیٹھا تھا۔
 اس نے چپ آصفت جاہ کے خلعت و خطاب کا حال سنا تو بہت بگڑا اور
 نادر شاہ سے کہا کہ حضور نے کیا غضب کیا جو ہندوستان کے قار و بی

۱۵۰ یہی ٹیپ بھی پوست بڑہ یعنی سیاہ و بے کی کمال کی ہوتی ہے۔

خزانے چھوڑ کر دو کروڑ روپیے پر رضامند ہو گئے یہ رقم تو فقط غلام ادا کر سکتا ہے اور بادشاہی خزانے اور امرا اور عیالوں کے گھرانوں کے کیا ٹھکانے ہیں! البتہ شہر یہاں سے چالیس کو س ہے حضور وہاں تک تکلیف فرمائیں۔ نادر شاہ خوش ہو گیا اور اسی وقت آصف جاہ کو بلا بھیجا۔ وہ خوشی خوشی پھر حاضر ہوا۔ اسے حکم ملا کہ تم ٹھہرو اور اپنے بادشاہ کو بلاؤ۔ آصف جاہ نے کہا کہ عہد نامے میں یہ نہیں ٹھہرا تھا۔ نادر نے کہا کہ ملک اور سلطنت اور بادشاہ کی عزت و آبرو سے ہمیں کچھ تعرض نہیں۔ ہم فقط ایک ملاقات اور کرنی چاہتے ہیں۔ آصف جاہ نے ناچار بادشاہ کو لکھا۔ بہت سے امرا اور لوگ ادھر سے ساتھ چلے کو تیار ہوئے مگر وہ فقط عہد الملک وغیرہ چند امیروں اور چند خواجہ سراؤں کو لے کر آئے۔ نادر شاہ نے عزت و احترام کیساتھ الگ خمیہ میں اتر دیا اور کہا کہ بھائی محمد شاہ سلطنت اور دربار کا سامان مع حرم کے منگوالو اور خاطر جمع سے یہیں رہو۔ لشکر میں بھی حکم بھیج دیا کہ جو چاہے ہمارے لشکر میں آجائے۔ اور جو چاہے دلی چلا جائے بعد اسکے اپنا فرمان اور بادشاہ سقہ ایک اپنے سردار کو ولی لکیر شہر کو روانہ کیا۔ اس نے جلتے ہی قلعہ دار سے کنیاں لیں اور سب کارخانوں پر قبضہ کر لیا۔ لشکر کے لوگ بے یار ہو کر بھاگے۔ بہتوں کو ولایتیوں نے لوٹ کر باندھ لیا جو ان سے بچے وہ رستے کے گوجروں نے مارے۔ جیتے بچے تو ننگے پلے گھر پہنچے۔ دوسرے

دن نادر شاہ بھی شاہ کو لے کر چلے اور دلی میں داخل ہوئے۔ پانچ چار دن کے بعد عید قربان آئی۔ مسجد میں خطبہ نادر شاہ کے نام سے پڑھا گیا اور چونکہ دھڑا دربار تھا اس لئے بڑی دھوم کا توڑک و احتشام ہوا مگر قربانی اس عید کی عجیب و غریب ہوئی یعنی عصر کے وقت تک تمام شہر میں امن و امان سے عیش و عشرت ہو رہی تھی۔ جو دفعۃً بھنگیڑ خانے میں بیٹھے بیٹھے ایک بھنگیڑ بولا کہ واہ محمد شاہ رنگیلے! آخر بادشاہی پیچ کھیل ہی گیا۔ دوسرا بولا کیا؟ اُس نے کہا کہ حرم سرا میں موقع تاک کر ایک قلماتی سے منغلے کو مروا دیا یہ ہوائی دفعۃً اڑی اور ہوا کی طرح تمام شہر میں پھیل گئی۔ غضب یہ ہوا کہ نادر می سپاہی جو ایک ایک دود و دگلی کو چوں میں بے تکلف پھرتے تھے۔ انھیں لوگوں نے بے وارنا سمجھ کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ رات کو نادر کو خبر پہنچی۔ اس نے فوج کو حکم دیا کہ اپنی جگہ پر قائم رہو اگر تم پر چڑھ کر آئیں تو جواب دو، نہیں تو چپ چاپ بیٹھے رہو۔ رات

۱۵ قلماتی اگرچہ ترکوں میں ایک فرقے کا نام ہے مگر ہندوستان میں قلماتی اور اردا بیگنی ان عورتوں کو کہتے تھے جو اسلحہ جنگ سے سچی رہتی تھیں اور حرم سرا میں سپاہیوں کی طرح پہرے وغیرہ کا کام کرتی تھیں۔

۱۶ یعنی نادر شاہ کو مروا ڈالا۔

بھر برابر تلوار چلتی رہی اور صبح تک سات سو ولایتی شہر میں کٹ گیا۔ افسوس
 یہ کہ ارکان دربار چپکے بیٹھے تماشا دیکھا کئے بلکہ چند اشخاص جن کو نادر شاہ
 سے کہہ کر اپنے گھر لے گئے تھے۔ وہ بھی مارے گئے۔ نادر نے صبح کو اٹھ کر
 پوچھا تو وہی حال سنا۔ حیران ہوا کہ کرنال کے معرکہ جنگ میں کل تین ولایتی
 مرے اور بیس آدمی زخمی ہوں اور شہر میں میرا صد ہا سپاہی اس طرح
 ضائع ہو جائے! دنیا آنکھوں میں اندھیرا معلوم ہونے لگی۔ اسی وقت
 نکلا اور گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کو دیکھتا ہوا چلا کہ شاید مجھے زندہ سلامت
 دیکھ کر یہ طوفان تھم جائے اور دہلی کے قتل عام کا دھبہ میرے نام پر نہ آئے۔
 مگر شہر کے لوگوں نے اس پر بھی ہتھ پھینکنے شروع کر دیے بلکہ بند و قیں
 بھی ماریں۔ یہاں تک کہ ایک مصاحب کا پہلو زخمی ہوا۔ ساتھ ہی دیکھا
 کہ جا بجا ایرانی غریب الوطنوں کے لاشے پڑے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس کی
 آنکھوں میں خون اُتر آیا اور قتل عام کا حکم دے کر کہہ دیا کہ جہاں تک کوئی
 قزلباش مرا ہوا نظر آئے ایک آدمی جیتا نہ رہے یہ کہہ کر ترپولے تک آیا
 اور روشن الدولہ کی مسجد میں آکر قتل عام کی علامت ظاہر کی یعنی تلوار
 کھینچ کر مسجد میں بیٹھ گیا۔ کوچوں میں خون کے نالے بہ گئے اور گھروں میں
 آگ لگ کر زمین سے آسمان تک دھواں دھار ہو گیا۔ نادر شاہ کا

غصہ خدا کا تہ۔ بادشاہ اور امیر سب دیکھتے تھے اور دم نہ مار سکتے تھے
ایک بڑھا خواجہ سراج محمد شاہ کے پاس روتا ہوا آیا اور کہا کہ حضور کے باپ
دادا کی رعیت سب قتل ہو گئی بادشاہ بھی آبدیدہ ہوئے اور تنہا کہا کہ ۵
دیدہ عبرت کشا قدرت حق راہیں شامت اعمال بصورت نادر گرفت
دوپہر کے قریب جب عالم میں کھرام مچ گیا تو پھر سب نے آصف جا
سے رجوع کی۔ وہ تلوار نگے میں ڈالے سر بر منہ کئے خاموش نادر کے
سامنے جا کھڑا ہوا اور رونے لگا۔ نادر شاہ کے دل میں بھی خدا نے
رحم ڈالا۔ پوچھا کہ چرمی خواہی؟ اُس نے یہ شعر پڑھا ۵
کے نمائد کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی
نادر نے شرمناک سر جھکا لیا۔ تلوار میان میں کی اور کہا کہ بہ ریش سفیدت
بخشیدم۔ اسی وقت، شہر میں ایرانی نقیب اور چاوش امان امان کہتے
ہوئے دوڑے اور پل کے پل میں اسن ہو گیا۔ سلطنت کے کاروبار
کے ساتھ دونوں بادشاہوں کی صحبتیں، پھر بدستور جاری ہو گئیں
ایک دن بادشاہ نے نادر کی دعوت کی۔ ایک ایک خدمت ایک
ایک امیر کے سپرد ہوئی۔ کھانے کے بعد جب چائے آئی عمدۃ الملک
نے پیالی چائے کی بھری مگر جب دینے لگا تو سوچا کہ اگر پہلے اپنے آقا کو

دو تو ادھر نادر ہے ایسا نہ ہوا بھی سر اڑا دے اور اگر نادر کو پہلے
دو تو آئندہ بھی اپنے دربار میں منہ دکھانا ہے۔ یہاں اس کی تیز نے
طبع کا جو ہر کام آیا۔ یعنی محمد شاہ کے سامنے پیالی کر کے کہا کہ شاہانِ بشتابا
مید ہند یعنی فدوی کی لیاقت نہیں کہ اس عالیجاہ بادشاہ کو چائے دے۔
آپ اپنے دست مبارک سے دیجئے۔ چنانچہ دونوں بادشاہ خوش ہوئے اور
دونوں کے اہل دربار نے اس انداز خوشنما پر تحسین و آفریں کی۔

لطیفہ۔ ایک دن نادر شاہ کو پیٹ میں گرانی معلوم ہوئی۔ محمد شاہ
سے حال بیان کیا۔ اسی وقت علوی خاں حکیم آیا اور نبض دیکھ کر دوا سنائی
کہ داروغہ کو اشارہ کیا۔ چنانچہ کشتیٰ مَرُصَع پر زر نگار خوان پوش پڑا ہوا آیا۔
خوان پوش اٹھایا تو ایک مَرُصَع مرتبان میں گلقد۔ الماس کا چچہ برابر دھڑل
گنگا جہنی کا نثار تھی ماشے سمیت وزن کے اندازے کے لئے ساتھ موجود تھا
اور حکیم سوچتا تھا کہ کس قدر گلقد اس میں سے نکالے اور وزن کر کے
کھانے کو دے۔ نادر شاہ نے خود مرتبان کو اٹھالیا اور کھول کر دیکھا۔
بعد اس کے دو انگلیاں اندر ڈال کر چار نوالوں میں مرتبان خالی کر دیا۔
چونکہ اس میں خوشبودار دوائیں بھی ملی ہوئی تھیں اچھا معلوم ہوا اور کہا
کہ ”حلوائے خوب است دیگر بیارید“

لطیفہ۔ ایک دن نادر شاہ ہوا کھانے کو سوار ہوا۔ محمد شاہ نے کہا

کہ ایران میں ہاتھی نہیں ہوتا۔ آج انھیں ہاتھی پر سوار کر دجب ہووچ
میں جا کر بیٹھا تو آگے فیلبان کو دیکھا۔ پوچھا ایں کیست؟ لوگوں نے کہا کہ
فیلبان است۔ ایں رامی راند۔ فیلبان سے کہا کہ عنانش بمن بدہ۔ اس نے
عرض کی کہ قبلہ عالم فیل عنان ندارد۔ بر اشارہ سر بایم راہ می رود۔ ناک چڑھا
بوللا۔ بنشانید کہ فرایم مہ کہے کہ عنانش بدست غیر باشد سواری را نشاید۔

لطیفہ محمد شاہ کے اہل نشاط میں ایک کنبی تھی۔ نور بانی اس کا نام
تھا اور ناچ گانے کے علاوہ حاضر جوابی اور لطیفہ گوئی کا یہ عالم تھا کہ گویا
منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ ایک دن نادر شاہ نے بھی اس کا گانا سنا۔
چنانچہ بہت مخطوط ہوئے کچھ انعام دیا اور کہا کہ نور بانی روئے بند را سیاہ
کن۔ بیا کہ بایر انت بریم۔ یہ سنتے ہی بانی جی کا دم بند ہو گیا اور ساری
لطیفہ گوئیاں بھول گئیں۔ دل میں ڈریں کہ خوش ہو کر ساتھ لے چلا ہے
اگر ذرا خفا ہو تو خدا جانے ناک کاٹ لے۔ آنکھ نکال لے یا پیٹ چاک کر ڈالے
غرض اسی وقت یہ غزل گائی ۵

من شمع جاں گدازم تو صبح دلکشانی سوزم گرت نہ بنیم میرم چورخ نمائی
نزدیکت این جنیم دور آں چنانکہ گفتم نے تاب وصل دارم نہ طاقت جدائی
نادر شاہ بہت خوش ہوا اور اس کا مطلب سمجھ کر اپنے اہل سے درگدرا

۵ فرود آیم کا منفع ہے یعنی ہاتھی کو بھادو کہ ہم اتر آئیں۔

اسی عرصے میں نصر اللہ میرزا نے اپنے بیٹے کی ایک شاہزادی سے شادی کی۔
 دو مہینے وہاں رہ کر خاطر خواہ نقد و جنس اور جواہر جس قدر سیمٹ سکا لیا
 کہ تخت طاؤس تک بھی اٹھالیا اور سونے چاندی کے چکی کے پاٹ ڈھلوا کر
 اونٹوں پر لد وادے۔ غرض کل تیس کروڑ روپیے کا اثاثہ لے کر روانہ ہوا
 اور ڈیرہ جات کابل اور پنجاب کے ان علاقوں کو جن کا روپیہ کابل کی فوج
 میں لگا ہوا تھا۔ انھیں ہندوستان سے نکال کر ایران کی سلطنت میں
 داخل کیا۔ محمد شاہ دو لٹا پھر یہاں رنگ رلیاں کرنے لگے اور چند سال
 کے بعد اسی عیش و عشرت سے تین برس سلطنت کر کے عالم بقا کو روانہ
 ہوئے۔

سرتید احمد خاں

پیدائش دہلی ۱۸۱۷ء

وفات علیگڑھ ۱۸۹۷ء

سرتید احمد خاں کے بزرگ شاہانِ مغلیہ کے متوسلین میں سے تھے اور
 اوائل عمر میں خاندانی توسل کے لحاظ سے ان کو بھی اسی دربار سے تعلق
 تھا لیکن بہ مقتضائے زمانہ شناسی جو آپ کے دماغ کا خاص جوہر تھا سرتید خاں
 عربی فارسی کی تعلیم اس زمانہ کے دستور کے مطابق حاصل کر کے ۱۸۳۷ء
 میں سرکارِ انگریزی کی ملازمت میں داخل ہوئے اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے
 سب ججی کے اعلیٰ عہدے تک پہنچے۔ ان کی اوّل تصنیف آثار الصنادیق ۱۸۴۷ء
 میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کا طرزِ تحریر پرانے ڈھنگ کا ہے اور
 اس میں دہلی کی غارات اور مشاہیر کا مفصل حال لکھا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے
 غدر کے زمانہ میں سرتید احمد خاں کے قدمِ جادہ و فاداری و غیر خواہی
 سے نہیں ٹوگے اور انھوں نے اپنی جانِ خطرو میں ڈال کر بخور کے انگریز
 حکام کی جان بچائی۔ غدر فرو ہونے کے بعد سرتید احمد خاں نے اپنی
 ساری توجہ مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی سوشل اصلاح کے طرف مبذول

کی اور اس مدعا کے حاصل کرنے کے لئے پہلے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا اور پھر مسئلہ میں علیگڑھ کالج کی بنا ڈالی۔ منشاء یہ تھا کہ ان کے وسیلہ سے مسلمانوں کے دلوں کو نئی روشنی کے نور سے منور کر کے ان میں تہذیب جدید کے اصولوں کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت میں جو بین تغیر پچھلے تیس برس میں واقع ہوا ہے وہ اس بات کا شاہد ہے کہ سیرتِ احمد خاں کو اپنی کوشش میں کہاں تک کامیابی ہوئی۔

ذیل کے مضامین تہذیب الاخلاق کی مختلف جلدوں سے اخذ کئے گئے ہیں۔



رسم و رواج

ماخوذ از تہذیب الاخلاق

جو لوگ کہنِ معاشرت اور تہذیب الاخلاق و شائستگی عادات پر بحث کرتے ہیں اُن کے لئے کسی ملک یا قوم کے کسی رسم و رواج کو اچھا اور کسی کو

جُرا ٹھسرا نا نہایت مشکل کام ہے ہر ایک قوم اپنے ملک کے رسم و
 رواج کو پسند کرتی ہے اور اُسی میں خوش رہتی ہے کیونکہ جن باتوں کی تھپٹ
 پن سے عادت اور موافقت ہو جاتی ہے وہی دل کو بھلی معلوم ہوتی ہیں
 لیکن اگر ہم اسی پر اکتفا کریں تو اس کے معنی یہ ہو جاویں گے کہ بھلائی اور
 برائی حقیقت میں کوئی چیز نہیں ہے بلکہ صرف عادت پر موقوف ہے
 جس چیز کا رواج ہو گیا عادت پڑ گئی وہی اچھی ہے اور جس چیز کا رواج نہ ہو
 اور عادت نہ پڑی وہی بُری ہے مگر یہ بات صحیح نہیں۔ بھلائی اور برائی
 فی نفسہ مستقل چیز ہے۔ رسم و رواج سے البتہ یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ کوئی
 اُس کے کرنے پر نام نہیں دھرتا۔ عیب نہیں لگتا کیونکہ سب کے سب
 اُس کو کرتے ہیں مگر ایسا کرنے سے وہ چیز اگر فی افسہ بُری ہے تو اچھی
 نہیں ہو جاتی پس ہم کو صرف اپنے ملک یا اپنی قوم کے رسومات کے
 اچھے ہونے پر بھروسہ نہ کر لینا چاہئے تاکہ اگر ہم میں کوئی ایسی بات
 جو حقیقت میں بر ہو اور بسبب رسم و رواج کے ہم کو اُس کی بدی خیال
 میں نہ آتی ہو تو معلوم ہو جائے اور وہ بدی ہمارے ملک یا قوم سے
 جاتی رہے۔ البتہ یہ کہنا درست ہو گا کہ بگاہِ میوب اور غیر میوب ہونا
 کسی بات کا زیادہ تر اُس کے رواج و عدم رواج پر منحصر ہو گیا ہے
 تو ہم کس طرح کسی امر کے رسم و رواج کو اچھا یا بُرا قرار دے سکیں گے

بلاشبہ یہ بات کسی قدر مشکل ہے مگر جبکہ یہ تسلیم کر لیا جاوے کہ بھلائی یا بُرائی
 فی نفسہ بھی کوئی چیز ہے تو ضرور ہر بات کی فی الحقیقت بھلائی یا بُرائی
 قرار دینے کے لئے کوئی نہ کوئی طریقہ ہوگا۔ پس ہم کو اس طریقہ کے
 تلاش کرنے اور اُسی کے مطابق اپنی رسوم و عادات کی بھلائی یا بُرائی
 قرار دینے کی پیروی کرنی چاہئے۔ سب سے مقدم اور سب سے ضروری
 امر اس کام کے لئے یہ ہے کہ ہم اپنے دل کو تعصبات سے اور ان تارکک
 خیالوں سے جو انسان کو سچی بات کے سُنے اور کرنے سے روکتے ہیں
 خالی کریں اور اُس دلی نیکی سے جو خدا تعالیٰ نے انسان کے دل میں
 رکھی ہے ہر ایک بات کی بھلائی یا بُرائی دریافت کرنے پر متوجہ ہوں
 یہ بات ہم کو اپنی قوم اور اپنے ملک اور دوسری قوم اور دوسرے ملک
 دونوں کے رسم و رواج کے ساتھ برتنی چاہئے تاکہ جو رسم و عادت
 ہم میں بھلی ہے اُس پر مستحکم رہیں اور جو ہم میں بُری ہے اُس کے
 چھوڑنے پر کوشش کریں اور جو رسم و عادت دوسروں میں اچھی ہے
 اُسکو بلا تعصب اختیار کریں اور جو ان میں بُری ہے اُس کے اختیار
 کرنے سے بچتے رہیں۔ جبکہ ہم غور کرتے ہیں کہ تمام دنیا کی قوموں میں
 جو رسوم و عادات مروج ہیں اُنھوں نے کس طرح اُن قوموں
 میں رواج پایا ہے تو باوجود مختلف ہونے اُن رسومات و عادات

اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ جو عادتیں اور رسمیں قوموں میں مروج ہیں انکار و اج یا تو ملک کی آب و ہوا کی خاصیت سے ہوا ہے یا ان اتفاقیہ امور سے جن کی ضرورت وقتاً فوقتاً بضرورت تمدن و معاشرت کے پیش آتی گئی ہے یا دوسرے قوم کی تقلید و اختلاط سے مروج ہو گئی ہیں یا انسان کی حالت ترقی یا تنزل نے اُس کو پیدا کر دیا ہے۔ پس ظاہر ایسی چار سبب ہر ایک قوم اور ہر ایک ملک میں رسوم و عادات کے مروج ہونے کا مبدار و منشاء معلوم ہوتے ہیں۔

جو رسوم و عادات کہ بمقتضائے آب و ہوا کسی ملک میں رائج ہوئی ہیں ان کے صحیح اور درست ہونے میں کچھ شبہ نہیں کیونکہ وہ عادتیں قدرت اور فطرت نے ان کو سکھلائی ہیں جس کے بیچ ہونے میں کچھ شبہ نہیں مگر صرف ان کے برتاؤ کا طریقہ غور طلب باقی رہتا ہے۔ مثلاً ہم یہ بات دیکھتے ہیں کہ کشمیر میں اور لندن میں سردی کے سبب انسان کو آگ سے گرم ہونے کی ضرورت ہے پس آگ کا استعمال ایک نہایت سچی اور صحیح عادت دونوں ملکوں کی قوموں میں ہے مگر اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آگ کے استعمال کے لئے یہ بات بہتر ہے کہ مکانات میں ہندی قواعد سے آتش خانہ بنا کر آگ کی گرمی سے فائدہ اٹھایں یا مٹی کی کانگریڈوں میں آگ جلا کر گردن میں لٹکائے پھر جس سے گورا گورا پیٹ اور سنہ

کالا اور کھونڈا ہو جاوے۔

طریق تمدن و معاشرت روز بروز انسانوں میں ترقی پاتا ہے اور اس لئے ضرور ہے کہ ہماری رسمیں و عادتیں جو بضرورت تمدن و معاشرت مروج ہوئی تھیں اُن میں بھی روز بروز ترقی ہوتی جاوے اور اگر ہم اپنی اُن پہلی ہی رسموں اور عادتوں کے پابند رہیں اور کچھ ترقی نہ کریں تو بلاشبہ بمقابل اُن قوموں کے جنہوں نے ترقی کی ہے ہم ذلیل اور خوار ہوں گے اور مثل جانوروں کے خیال کئے جاویں گے پھر خواہ اس نام سے ہم بُرا مانیں یا نہ مانیں۔ انصاف کا مقام ہے کہ جب ہم اپنے سے کمتر اور ناتربیت یافتہ قوموں کو ذلیل و حقیر مثل جانوروں کے خیال کرتے ہیں تو جو قومیں کہ ہم سے زیادہ شنائیت و تربیت یافتہ ہیں اگر وہ بھی ہم کو اُسی طرح حقیر و ذلیل مثل جانوروں کے سمجھیں تو ہم کو کیا مقام شکایت ہے۔ ہاں اگر ہم کو غیرت ہے تو ہم کو اس حالت سے نکلنا اور اپنی قوم کو نکالنا چاہئے۔ دوسری قوموں کی رسومات کا اختیار کرنا اگر چہ بے نقصتی اور دانائی کی دلیل ہے مگر جب وہ رسمیں اندھے پن سے صرف تقلید بغیر سمجھے ہوئے اختیار کی جاتی ہیں تو کافی ثبوت نادانی اور حماقت کا ہوتی ہیں۔ دوسری قوموں کی رسومات اختیار کرنے میں اگر ہم دانائی اور ہوشیاری سے کام کریں تو اُس قوم سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں

اس لئے کہ ہم کو اُس رسم سے تو موانست نہیں ہوتی اور اس سبب سے اس کی حقیقی بھلائی یا بُرائی پر غور کرنے کا بشرطیکہ ہم تعصب کو کام میں لاویں بہت اچھا موقع ملتا ہے اُس قوم کے حالات دیکھنے سے جس میں وہ رسمیں جاری ہیں ہم کو بہت عمدہ مثالیں سیکڑوں برس کے تجربہ کی ملتی ہیں جو اُس رسم کے اچھے یا بُرے ہونے کا قطعی تصفیہ کر دیتی ہیں۔ مگر یہ بات اکثر جگہ موجود ہے کہ ایک قوم کی رسمیں دوسری قوم میں بسبب اختلاط اور ملاپ کے اور بغیر قصد و ارادہ کے اور اُن کی بھلائی اور بُرائی پر غور و فکر کرنے کے بغیر داخل ہو گئے ہیں جیسے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا بالتخصیص حال ہے کہ تمام معاملات زندگی بلکہ بعض امورات مذہبی میں بھی ہزاروں رسمیں غیر قوموں کی بلا غور و فکر اختیار کر لی ہیں۔ یا کوئی نئی رسم مشابہ اُس قوم کی رسم کے ایجاد کر لی ہے مگر جب ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے طریق معاشرت اور تمدن کو اعلیٰ درجہ کی تہذیب پر پہنچا دیں تاکہ جو قومیں ہم سے زیادہ مہذب ہیں وہ ہم کو بہ نظر حقارت نہ دیکھیں تو ہمارا فرض ہے کہ اپنی تمام رسوم و عادات کو بہ نظر تحقیق دیکھیں اور جو بُری ہوں اُن کو چھوڑیں اور جو قابل اصلاح ہوں ان میں اصلاح کریں۔

جو رسومات کہ بسبب حالت ترقی یا تنزل کسی قوم کے پیدا ہوتی

ہیں وہ ہمیں ٹھیک ٹھیک اُس قوم کی ترقی اور تنزل یا عزت اور ذلت کی نشانی ہوتی ہیں۔ اس مقام پر ہم نے لفظ ترقی یا تنزل کو نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے اور تمام قسم کے حالات ترقی یا تنزل مراد لئے ہیں خواہ وہ ترقی و تنزل خلاق سے متعلق ہو۔ خواہ علوم و فنون اور طریق معاشرت و تمدن سے اور خواہ ملک و دولت و جاہ و حشمت سے۔ بلاشبہ یہ بات تسلیم کرنے کے قابل ہے کہ دُنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں نکلنے کی جس کی تمام زمین اور عادتیں عیب اور نقصان سے خالی ہوں مگر اتنا فرق بے شک ہے کہ بعض قوموں میں ایسی رسومات اور عادات جو درحقیقت نفس الامریں بُری ہوں کم ہیں اور بعض میں زیادہ اور اسی وجہ سے وہ پہلی قوم کچھلی قوم سے اعلیٰ اور معزز ہے اور بعض ایسی بھی قومیں ہیں جنہوں نے انسان کی حالت ترقی کو نہایت اعلیٰ درجہ تک پہنچایا ہے اور اس حالت انسانی کی ترقی نے اُن کے نقصانات کو چھپا لیا ہے جیسے ایک نہایت عمدہ و نفیس شیریں دریا تھوڑے سے گدھے اور کھاری پانی کو چھپا لیتا ہے یا ایک نہایت لطیف شربت کا بھرا ہوا پیالہ میو کی کھٹی دو بوندوں سے زیادہ تر لطیف اور خوشگوار ہو جاتا ہے اور یہی قومیں ہیں جو اب دُنیا میں سویلینز و مندب گنی جاتی ہیں اور درحقیقت اس لقب کی مستحق بھی ہیں۔

خوشامد

دل کی جس قدر بیماریاں ہیں اُن میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے جس وقت کہ انسان کے بدن میں ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو دہانی ہوا کے اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے تو اُسی وقت انسان مرض مہلک میں گرفتار ہو جاتا ہے اسی طرح جبکہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اُس کے دل میں ایک ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو ہمیشہ زہر ملی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے جس طرح کہ خوش گلو گای فوالے کی آواز اور خوش آئند باجے کی آواز انسان کے دل کو نرم کر دیتی ہے اسی طرح خوشامد بھی انسان کے دل کو ایسا پکھلا دیتی ہے کہ ہر ایک کٹے کے چھینے کی جگہ اُس میں ہو جاتی ہے۔ اول اول یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی آپ خوشامد کرتے ہیں اور اپنی ہر ایک چیز کو اچھا سمجھتے ہیں اور آپ ہی آپ خوشامد کر کر اپنے دل کو خوش کرتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اوروں کی خوشامد ہم میں اثر کرنے لگتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول تو خود ہم کو اپنی محبت پیدا ہوتی ہے پھر یہی محبت ہم سے باغی ہو جاتی ہے اور ہمارے بیرونی دشمنوں سے جا ملتی ہے اور جو محبت و مہربانی ہم خود اپنے ساتھ کرتے تھے وہ ہم خوشامدیوں کے ساتھ کرنے لگتے ہیں اور وہی ہماری محبت ہم کو

یہ بتلاتی ہے کہ اُن خوشامدیوں پر مہربانی کرنا نہایت حق اور انصاف ہے جو ہماری باتوں کو ایسا سمجھتے ہیں اور اُن کی اس قدر قدر کرتے ہیں جبکہ ہمارا دل ایسا نرم ہو جاتا ہے اور اس قسم کے پھسلا دے اور فریب میں آ جاتا ہے تو ہماری عقل خوشامدیوں کے مکرو فریب سے اندھی ہو جاتی ہے اور وہ مکرو فریب ہماری بیا رطبیعت پر بالکل غالب آ جاتا ہے۔ لیکن اگر ہر شخص کو یہ بات معلوم ہو جاوے کہ خوشامد کا شوق کیسے نالائق اور کمینہ سببوں سے پیدا ہوتا ہے تو یقینی خوشامد کی خواہش کم ہو جائے گی۔ لیکن ویسا ہی نالائق اور کمینہ تصور ہونے لگے گا جبکہ ہم کو کسی ایسے وصف کا شوق پیدا ہوتا ہے جو ہم میں نہیں ہے یا ہم ایسے بنا چاہتے ہیں جیسے کہ درحقیقت ہم نہیں ہیں تب ہم اپنے تئیں خوشامدیوں کے حوالہ کرتے ہیں جو اوروں کے اوصاف اور اوروں کی خوبیاں ہم میں لگانے لگتے ہیں۔ گو سب اُس کمینہ شوق کے اُس خوشامدی کی باتیں ہم کو اچھی لگتی ہوں مگر درحقیقت وہ ہم کو ایسی ہی بدزیب ہیں جیسے کہ دوسرے کے کپڑے جو ہمارے بدن پر کسی طرح ٹھیک نہیں۔ اس بات سے کہ ہم اپنی حقیقت کو چھوڑ کر دوسرے کے اوصاف اپنے میں سمجھنے لگیں یہ بات نہایت عمدہ ہے کہ ہم اپنی حقیقت کو درست کریں اور سچ سچ وہ اوصاف خود اپنے میں پیدا کریں اور بوض جھوٹی نقل بننے کے خود ایک اچھی

اصل ہو جاویں کیونکہ ہر قسم کی طبیعتیں جو انسان رکھتے ہیں اپنے اپنے موقع پر مفید ہو سکتی ہیں۔ ایک تیز مزاج اور حسِ چالاک آدمی اپنے موقع پر ایسا ہی مفید ہوتا ہے جیسے کہ ایک رونی صورت کا چُپ چاپ آدمی اپنے موقع پر۔

خودی جو انسان کو برباد کرنے کی چیز ہے جب چُپ چاپ سوئی ہوتی ہے تو خوشامد اُس کو جگاتی اور اُبھارتی ہے اور جس چیز کی خوشامد کی جاتی ہے اُس میں چھوڑے پن کی کافی لیاقت پیدا کر دیتی ہے۔ مگر یہ بات بخوبی یاد رکھنی چاہئے کہ جس طرح خوشامد ایک بدتر چیز ہے اسی طرح مناسب اور سچی تعریف کرنا نہایت عمدہ اور بہت ہی خوب چیز ہے جس طرح کہ لائق شاعر دوسروں کی تعریف کرتے ہیں کہ اُن اشعار سے اُن لوگوں کا نام باقی رہتا ہے جن کی وہ تعریف کرتے ہیں اور شاعری کی خوبی سے خود اُن شاعروں کا نام بھی دنیا میں باقی رہتا ہے۔ دونوں شخص خوش ہوتے ہیں۔ ایک اپنی لیاقت کے سبب سے اور دوسرا اُس لیاقت کو تمیز کرنے کے سبب سے مگر لیاقت شاعری کی یہ ہے کہ وہ نہایت بڑے استاد مصوّر کی مانند ہو کہ وہ اصل صورت اور رنگ اور خال خط کو بھی قائم رکھتا ہے اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہے کہ خوشنما معلوم ہو۔ ایسا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اس

بات کا خیال نہیں رکھتے بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں اس کے اوصاف
ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں جن کے سبب سے وہ تعریف اعر
نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں۔ ناموری کی مثال نہایت عمدہ
خوشبو کی ہے جب ہوشیاری اور سچائی سے ہماری واجب تعریف ہوتی ہے
تو اس کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے عمدہ خوشبو کا مگر کسی کمزور دماغ میں برکتی
سے وہ خوشبو ٹھونس دی جاتی ہے تو ایک تیز بوی کی مانند دماغ کو پریشان
کر دیتی ہے۔ فیاض آدمی کو بدنامی اور نیکنامی کا زیادہ خیال ہوتا ہے اور
عالی ہمت طبیعت کو مناسب عزت اور تعریف سے ایسی ہی تقویت
ہوتی ہے جیسے کہ غفلت اور حقارت سے پست ہمتی ہوتی ہے۔ جو
لوگ کہ عوام کے درجہ سے اوپر ہیں انہیں لوگوں پر اس کا زیادہ اثر ہوتا
ہے جیسے کہ تھرمامیٹر میں وہی حصہ موسم کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے جو
صاف اور سب سے اوپر ہوتا ہے۔

سولزیشن یا تہذیب

ہم دریافت کیا چاہتے ہیں کہ سولزیشن کیا چیز ہے اور کن کن چیزوں سے علاقہ رکھتی ہے۔ کیا کوئی بتائی ہوئی چیز ہے یا قدرت نے انسان کی فطرت میں اس کو پیدا کیا ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں کیا یہ کوئی اصطلاح ہے جس کو لوگوں نے یا فیلسوفوں نے مقرر کیا ہے۔ یا یہ ایسی چیز ہے کہ اس کا مفہوم اور جن جن چیزوں سے اس کا تعلق ہے قانون قدرت میں پایا جاتا ہے۔ اس امر کے تصفیہ کے لئے انسان کے حالات پر ہم کو نظر کرنی چاہئے اگر تہذیب انسانی میں ایک فطرتی چیز ہے تو وحشیوں میں شہریوں میں سب میں اس کا نشان ملے گا گو اُس کی صورتیں مختلف دکھائی دیتی ہوں الا سب کی جڑ ایک ہی ہوگی۔ انسان میں ایک یہ فطرتی بات ہے کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور کسی کو ناپسند یا یوں کہو کہ کسی چیز کو اچھا ٹھہرتا ہے اور کسی چیز کو بُرا اور مکی طبیعت اس طرف مائل ہے کہ اُس بُری چیز کی حالت کو ایسی حالت سے تبدیل کر لے جسکو وہ اچھا سمجھتا ہے یہی چیز سولزیشن کی جڑ ہے جو انسان کے ہر گروہ میں اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے۔ اسی تبادلہ

کا نام سولزیشن یا تہذیب ہے اور کچھ نہیں کہ یہ میلان یا یہ خواہش تبادله انسان میں
 قدرتی یا فطرتی ہے سولزیشن یا تہذیب کی طرف انسان کی طبیعت کے نائل ہونیکے
 دو اصول ٹھہرے اچھا اور بُرا۔ اور برے کو اچھا کرنا سولزیشن یا تہذیب ٹھہری
 مگر اچھا اور بُرا قرار دینے کے مختلف اسباب خلقی اور خالق کی ملکی اور تمدنی ایسے ہوتے
 ہیں جن کے سبب اچھا اور بُرا ٹھہرانے میں یا یوں کہو کہ قوموں کی
 سولزیشن میں اختلاف پڑ جاتا ہے ایک قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہے
 اور داخل تہذیب جانتی ہے دوسری قوم اُسی بات کو بہت بُرا اور
 وحشیانہ حرکت قرار دیتی ہے یہ اختلاف سولزیشن کا قوموں کے باہم
 ہوتا ہے۔ اشخاص میں نہیں ہوتا یا بہت ہی کم ہوتا ہے۔ جبکہ ایک گروہ
 انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر رہتا ہے تو اکثر اُن کی ضرورتیں اور اُنکی
 حاجتیں۔ اُن کی غذائیں اور اُنکی پوشاکیں۔ ان کی معلومات اور اُنکے
 خیالات اُن کی مسرت کی باتیں اور ان کی نفرت کی چیزیں سب یکساں
 ہوتی ہیں اور اسی لئے بُرائی اور اچھائی کے خیالات بھی سب یکساں پیدا
 ہوتے ہیں اور بُرائی کو اچھائی سے تبدیل کی خواہش سب میں
 ایک سی ہوتی ہے اور یہی مجموعی خواہش تبادله یا مجموعی خواہش سے
 وہ تبادله اس قوم یا گروہ کی سولزیشن ہے۔ مگر جبکہ مختلف گروہیں
 مختلف مقامات میں بستی ہیں تو اُن کی حاجتیں اور خواہشیں بھی مختلف

ہوتی ہیں اور اس سبب سے تہذیب کے خیالات بھی مختلف ہوتے ہیں مگر ضرور کوئی ایسی چیز بھی ہوگی کہ جو سولزیشن کی ان مختلف حالتوں کا تصفیہ کر سکے۔ ملکی حالتیں جہاں تک کہ وہ بود و باش سے تعلق رکھتی ہیں نہ فکر اور خیال اور دماغ سے اُن کو تہذیب سے چنداں تعلق نہیں بلکہ صرف انسان کے خیال کو اُس سے تعلق ہے جس کے سبب وہ اچھا اور بُرا ٹھہرتا ہے اور جس باعث سے خواہش تبادلہ تحریک میں آتی ہے اور وہ تبادلہ واقع ہوتا ہے جو سولزیشن کہلاتا ہے۔ پس سولزیشن کی مختلف حالتوں کا فیصلہ وہ اسباب کر سکتے ہیں جن کے سبب سے اچھے اور بُرے کا خیال دل میں بیٹھا ہے۔ اچھے اور بُرے کی جگہ میں اور لفظ کا استعمال کروں گا یعنی پسند اور ناپسند۔ انگریزی میں ایک لفظ ٹیسٹ ہے جو نہایت وسیع معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ ہماری زبان میں بھی اُس قسم کے لفظ ہیں جیسے کہ مزایا مذاق۔ مگر وہ استعمال میں ایسے خاص ہو گئے ہیں کہ اُن سے وہ عام اور وسیع معنی خیال میں نہیں آتے۔ اس واسطے میں اُس لفظ کا ترجمہ ”پسند“ کرتا ہوں۔ پس پسند کا صحیح ہونا جو خیال کے صحیح ہونے کی فرع ہے۔ بہت بڑا وسیلہ سولزیشن کی مختلف حالتوں کے تصفیہ کا ہے۔ خیال کی درستی اور پسند کی صحت کثرت معلومات پر اور علم طبعیات سے بخوبی ماہر ہونے پر منحصر ہے۔ انسان کی معلومات کو

روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ سولزیشن بھی بڑھتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ آئندہ کوئی ایسا زمانہ آوے کہ انسان کی تہذیب میں ایسی ترقی ہو کہ اس زمانہ کی تہذیب کو بھی وہ ایسے ہی ٹھنڈے دل سے دیکھیں جیسے کہ ہم اپنے سے اگلوں کی تہذیب کو ایک ٹھنڈے مگر مودب دل سے دیکھتے ہیں۔ تہذیب یا یوں کہو کہ بُری حالت سے اچھی حالت میں لانا دنیا کی تمام چیزوں سے اخلاقی ہوں یا مادی یکساں تعلق رکھتا ہے اور تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ تکلیف سے بچنے اور آسائش حاصل کرنیکا سب کو یکساں خیال ہے۔ ہنر اور اُسکو ترقی دینا تمام دنیا کی قوموں میں موجود ہے۔ ایک تربیت یافتہ قوم زور و جواہر یا قوت و الماس سے نہایت نفیس خوبصورت زیور بناتی ہے۔ ناتربیت یافتہ قوم بھی کوڑیوں اور پونچھوں سے اپنی آرائش کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ تربیت یافتہ قومیں اپنی آرائش میں سونے چاندی آمونگے اور موتیوں کو کام میں لاتی ہیں۔ ناتربیت یافتہ قومیں جانوروں کے خوبصورت اور رنگین پروں کو تیلیوں پر سے چھلے ہوئے سُتھرے پوست اور زرد کی سی رنگ کی باریک اور خوشنما گھانسن میں گوندھ کر اپنے تئیں آراستہ کرتی ہیں۔ تربیت یافتہ قوموں کو بھی اپنے لباس کی درستی کا خیال ہے۔ ناتربیت یافتہ قومیں بھی اُس کی درستی پر مصروف

ہیں۔ شاہی مکانات، نہایت عمدہ اور عايشان بنتے ہیں اور نفیس چرواہے سے آراستہ ہوتے ہیں۔ نائتر بیت یافتہ قوموں کے بھر پڑے اور اُن کے رہنے کے گھوپنے درختوں پر باندھے ہوئے ٹائڈ۔ زمین میں گھدی ہوئی کھوئیں بھی تہذیب سے خالی نہیں۔ معاشرت کی چیزیں۔ تمدن کے قاعدے۔ عیش و عشرت کی مجلس۔ خاطر اور مدارات کے کام اور اخلاق و محبت کی علامتیں۔ دونوں میں پائی جاتی ہیں۔ علمی خیالات سے بھی نائتر بیت یافتہ قومیں خالی نہیں بلکہ بعض چیزیں اُن میں زیادہ اصلی اور قدرتی طور سے دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً شاعری جو ایک نہایت عمدہ فن تربیت یافتہ قوموں میں ہے۔ نائتر بیت یافتہ قوموں میں عجیب عمدگی و خوبی سے پایا جاتا ہے۔ یہاں خیالی باتوں کو ادا کیا جاتا ہے اور وہاں دلی جوشوں اور اندرونی جذبول کا اظہار ہوتا ہے۔ موسیقی نے تربیت یافتہ قوموں میں نہایت ترقی پائی ہے مگر نائتر بیت یافتہ قوموں میں بھی عجیب کیفیت دکھائی ہے۔ ان کی ادا اور آواز کی پھرت۔ اُسکا گھٹاؤ اور اُس کا بڑھاؤ۔ اُس کا ٹھہراؤ اور اُس کی اوچ۔ ہاتھوں کا بھاؤ اور پاؤں کی دھمک زیادہ تر مصنوعی قواعد کی پابند ہے مگر نائتر بیت یافتہ قوموں میں یہ سب چیزیں دلی جوش کی موجب ہیں۔ وہ لے اور تال۔ راگ و راگنی کو نہیں جانتے مگر دل کی لہر اُن کی لے اور دل کی بھڑک نکلا

سال ہے۔ اُن کا غول باندھ کر کھڑا ہونا۔ طبعی حرکت کے ساتھ اچھلنا۔
 دل کی بیتابی سے جھکنا اور پھر جوش میں آکر سیدھا ہو جانا گونزاکت
 اور فن خنیاگری سے خالی ہو مگر قدرتی جذبوں کی ضرورت تصویر ہے۔ دلی
 جذبوں کا روکنا اور اُن کو عمدہ حالت میں رکھنا۔ تمام قوموں کے خیالات
 میں شامل ہے۔ پس جس طرح کہ ہم تہذیب کا قدرتی لگاؤ تمام انسانوں
 میں پاتے ہیں اسی طرح اُس کا تعلق اصلی اور مادی چیزوں میں دیکھتے
 ہیں جس چیز میں کہ ترقی یعنی بُرائی سے اچھائی کی طرت رجوع یا اونچی درجہ
 کی طرف تحریک ہو سکتی ہے اُسی سے تہذیب بھی متعلق ہے۔ پس سولزیشن
 یا تہذیب کیا ہے؟ انسان کے افعال ارادی اور جذبات نفسانی
 کو اعتدال پر رکھنا۔ وقت کو عزیز سمجھنا۔ واقعات کے اسباب کو ڈھونڈنا
 اور ان کو ایک سلسلہ میں لانا۔ اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور طریق
 تمدن اور علوم و فنون کو بقدر امکان قدرتی خوبی اور فطرتی عمدگی پر پہنچانا
 اور اُن سب کو خوش اسلوبی سے برتنا اور اُس کا نتیجہ کیا ہے۔ روحانی خوشی
 اور جسمانی خوبی اور اصلی تکلیف اور حقیقی وقار اور خود اپنی عزت کی عزت اور
 درحقیقت یہی پچھلی ایک بات ہے جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت میں
 تمیز ہوتی ہے۔ اس تہذیب کے حاصل ہونے کے بقول مسٹر ایچ۔ ٹی
 بکل صاحب کے چار اصول ہیں۔ اول ”جو چیزیں ہم کو دکھائی دیتی ہیں اور

جن کا سبب ہم کو معلوم نہیں ہوتا۔ اُن کے سببوں اور قاعدوں کو دریافت کرنا اور اُن کے علوم کو پھیلانا پس جس قدر کامیابی اس میں ہوگی اُسی قدر انسان کی ترقی ہوگی۔ ”دوم“ اس تحقیقات سے پہلے تجسس کا خیال پیدا ہونا چاہئے جس سے ابتدا میں تحقیقات کو مدد ملتی ہے اور بعد کو تحقیقات سے اُس کی استعانت ہوتی ہے۔ ”سوم“ جو باتیں اس طرح دریافت ہوتی ہیں وہ عقلی باتوں کے اثر کو زیادہ کرتی ہیں اور اخلاق کی باتوں کو کسی قدر کم مگر اخلاق کی باتیں بہ نسبت عقلی باتوں کے زیادہ مستقل ہیں اور ان میں کمی بیشی بہت کم ہوتی ہے۔ ”چہارم“ اس تحریک کا بڑا دشمن جو حقیقت سولریشن کا بھی سخت دشمن ہے۔ یہ خیال ہے کہ جب تک زندگی کے امور ات کی نگرانی ہر طرح پر سلطنت اور مذہب سے نہ ہو۔ تب تک انسان کے گروہ کی ترقی نہیں ہو سکتی یعنی سلطنت رعایا کو سکھلاوے کہ اُن کو کیا کرنا چاہئے اور مذہب یہ سکھلاوے کہ کس بات پر یقین کرنا چاہئے۔“

اپنی مدد آپ

خدا اُن کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں۔

یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ مقولہ ہے اس چھوٹے سے فقرہ میں انسانوں کا اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے۔ ایک شخص میں اپنے آپ مدد کرنے کا جوش اُس کی سچی ترقی کی بنیاد ہے، اور جبکہ یہ جوش بہت سے شخصوں میں پایا جاوے تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور قومی مضبوطی کی جڑ ہے جبکہ کسی شخص کے لئے یا کسی گروہ کے لئے کوئی دوسرا کچھ کرتا ہے تو اُس شخص میں سے یا اُس گروہ میں سے وہ جوش اپنی آپ مدد کر نیکام ہو جاتا ہے، اور ضرورت اپنی آپ مدد کرنے کی اُسکے دل سے شقی جاتی ہے، اور اُسی کے ساتھ غیرت جو ایک نہایت عمدہ قوت انسان میں ہے اور اُسی کے ساتھ عزت جو اصلی چمک دمک انسان کی ہے از خود جاتی رہتی ہے، اور جبکہ ایک قوم کی قوم کا یہ حال ہو تو وہ ساری قوم، دوسری قوموں کی آنکھ میں ذلیل اور بے عزت اور بے عزت ہو جاتی ہے۔ آدمی جس قدر دوسرے پر بھروسہ کرتے جاتے ہیں۔ خواہ اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کا بھروسہ گورنمنٹ ہی پر

کیوں نہ کریں یہ امر بدیہی اور لابدی ہے کہ وہ اسی قدر بے مدد اور بے عزت
 ہوتے جاتے ہیں۔ اے میرے جموطن بھائیو! کیا تمہارا ایسی حال نہیں ہے؟
 ایشیا کی تمام قومیں یہی سمجھتی رہی ہیں کہ اچھا بادشاہ ہی رعایا کی
 ترقی اور خوشی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یورپ کے لوگ جو ایشیاء کے لوگوں سے
 زیادہ ترقی کر گئے تھے۔ یہ سمجھتے تھے ایک عداوت نظام قوم کی عزت و بھلائی و
 خوشی اور ترقی کا ذریعہ ہے۔ خواہ وہ انتظام باہمی قوم کے ہم درواج
 کا ہو یا گورنمنٹ کا اور یہی سبب ہے کہ یورپ کے لوگ قانون بنانے
 والی مجلسوں کو بہت بڑا ذریعہ انسان کی ترقی و بہبودی کا خیال کر کے
 اُن کا درجہ سب سے اعلیٰ اور نہایت بیش بہا سمجھتے تھے مگر حقیقت
 میں سب خیال غلط ہیں۔ ایک شخص فرض کرو کہ وہ لندن میں آئرلینڈ
 کی طرف سے پارلیمنٹ کا ممبر ہی کیوں نہ ہو جائے یا کلکتہ میں ایسا
 اور گورنر جنرل کی کونسل میں ہندوستان کا ممبر ہی ہو کر کیوں نہ بیٹھ
 جاوے۔ قومی عزت اور قومی بھلائی کی ترقی کیا کر سکتا ہے۔ برس
 دو برس میں کسی بات پر ووٹ دینے سے گو وہ کیسی ہی ایماندار سی
 اور انصاف سے کیوں نہ دیا ہو۔ قوم کی کیا بھلائی ہو سکتی ہے بلکہ خود
 اُس کے چال چلن پر اُس کے برتاؤ پر بھی اُس سے کوئی اثر پیدا
 نہیں ہوتا تو قوم کے برتاؤ پر کیا اثر پیدا کر سکتا ہے۔ ہاں یہ بات

بے شبہ ہے کہ گورنمنٹ سے انسان کے برتاؤ میں کچھ مدد نہیں ملتی۔
 مگر عمدہ گورنمنٹ سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی آزادی سے اپنے قولے
 تکمیل اور اپنی شخصی حالت کی ترقی کر سکتا ہے۔ یہ بات روز بروز روشن
 ہوتی جاتی ہے کہ گورنمنٹ کا فرض بہ نسبت ثابت اور عمل ہونے کے
 زیادہ منفی اور مانع ہے اور وہ فرض جان اور مال اور آزادی کی حفاظت
 ہے جبکہ قانون کا عمل درآمد دانشمندی سے ہوتا ہے تو آدمی اپنی جسمی اور
 ذہنی محنت کے ثمروں کا بے خطرہ خطا اٹھا سکتا ہے۔ جس قدر گورنمنٹ
 کی حکومت ہوتی ہے اتنا ہی ذاتی نقصان کم ہوتا ہے مگر کوئی قانون
 گو وہ کیسا ہی اُبھارنے والا کیوں نہ ہو سست آدمی کو محنتی۔ فضول خرچ
 کو کفایت شعار۔ شراب خوار کو تائب نہیں بنا سکتا بلکہ یہ باتیں شخصی
 محنت۔ کفایت شعار می نفس کشی سے حاصل ہو سکتی ہیں قومی ترقی
 قومی عزت۔ قومی اصلاح۔ عمدہ عادتوں۔ عمدہ چال چلن۔ عمدہ برتاؤ کرینے
 ہوتی ہے۔ نہ گورنمنٹ میں بڑے بڑے حقوق اور اعلیٰ اعلیٰ درجہ حاصل کرینے۔
 پُرانے لوگوں کا مقولہ ہے کہ ”النَّاسُ عَلَى دِينِ مُلُوكِهِمْ“ اگر اس
 مقولہ میں ”الناس“ سے چند خاص آدمی مراد لئے جاویں جو بادشاہ کے مقرب ہوتے ہیں تو یہ قول
 صحیح ہے اور اگر یہ معنی لئے جاویں کہ رعایا اپنی گورنمنٹ کی ہی ہو جاتی ہے تو یہ مقولہ صحیح نہیں ہے۔
 رعایا کبھی گورنمنٹ کے رنگ میں نہیں لگی جاتی۔ بلکہ گورنمنٹ رعایا کا رنگ ملتی جاتی ہے نہایت

ٹھیک بات ہے کہ گورنمنٹ عموماً اُن لوگوں کا جن پر وہ حکومت کرتی ہے عکس ہوتی ہے جو رنگ ان کا ہوتا ہے اسی کا عکس گورنمنٹ میں پایا جاتا ہے جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے تہذیب و شائستگی میں آگے بڑھی ہوئی ہے، رعایا اُس کو زبردستی سے پیچھے کھینچ لاتی ہے مگر جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے کمتر اور تہذیب و شائستگی میں پیچھے ہوتی ہے وہ ترقی کے دوڑ میں رعایا کے ساتھ آگے کچھ جاتی ہے۔ تاریخ کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان و انگلستان کا یہی حال ہوا۔ انگلستان کی رعایا تہذیب و شائستگی میں اُس زمانے کی گورنمنٹ سے آگے بڑھی ہوئی تھی۔ اُس نے زبردستی سے گورنمنٹ کو اپنے ساتھ آگے کھینچ لیا۔ ہندوستان کی رعایا تہذیب و شائستگی میں موجودہ گورنمنٹ سے کچھ پیچھے پڑی ہے۔ گورنمنٹ کتنا کھینچنا چاہتی ہے مگر وہ نہیں کھینچتی بلکہ زبردستی سے گورنمنٹ کو پیچھے کھینچ لاتی ہے یہ ایک نیچر کا قاعدہ ہے کہ جیسا مجموعہ قوم کے چال چلن کا ہوتا ہے یقینی اُسی کے موافق اُس کے قانون اور اسی کے مناسب حال گورنمنٹ ہوتی ہے کہ جس طرح پانی اپنی پنسال میں آ جاتا ہے۔ اسی طرح عمدہ رعایا پر عمدہ حکومت ہوتی ہے، اور جاہل و خراب و ناتربیت یافتہ رعایا پر ویسی ہی اکثر حکومت کرنی پڑتی ہے۔ تمام تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ کسی ملک کی خوبی و عمدگی

اور قدر و منزلت بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر اُس مُلک کی رعایا کے چال چلن۔ اخلاق و عادت۔ تہذیب و شائستگی پر منحصر ہے۔ کیونکہ قوم شخصی حالت کا مجموعہ ہے اور ایک قوم کی تہذیب و حقیقت اُن مرد و عورت و بچوں کی شخصی ترقی ہے جن سے وہ قوم بنتی ہے قومی ترقی مجموعہ ہے شخصی محنت شخصی عزت۔ شخصی ایمان داری۔ شخصی بہمردی کا۔ اسی طرح قومی تنزل مجموعہ ہے شخصی سُستی۔ شخصی بے عزتی۔ شخصی بے ایمانی شخصی خود عرضی کا اور شخصی بُرائیوں کا لانا تہذیبی و بد چلنی جو اخلاقی و تمدنی یا باہمی معاشرت کی بدیوں میں شمار ہوتی ہے و حقیقت وہ خود اُسی شخصی کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ بیرونی کوشش سے اُن بُرائیوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالیں اور نیست و نابود کر دیں تو یہ بُرائیاں کسی اور نئی صورت میں اُس سے بھی زیادہ زور شور سے پیدا ہو جاویں گی۔ جب تک شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی حالتوں کی ترقی نہ کی جاوے۔ اے میرے عزیز ہموطنو اگر یہ رائے صحیح ہے تو اُس کا یہ نتیجہ ہے کہ قوم کی سچی بہمردی اور سچی خیر خواہی کروغور کرو کہ تمہاری قوم کی شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کس طرح پر عمدہ ہوتا کہ تم بھی ایک معزز قوم بنو۔ کیا جو طریقہ تعلیم و تربیت کا۔ بات چیت کا وضع و لباس کا۔ سیر سپاٹے کا۔ شغل اشغال کا تمہاری اولاد کے لئے ہے، اُس سے اُن کے شخصی چال چلن اخلاق

عادت نیکی و سچائی میں ترقی ہو سکتی ہے؛ حاشا و کلاً۔ جبکہ ہر شخص و کل قوم خود اپنی اندرونی حالتوں سے آپ اپنی اصلاح کر سکتی ہے تو اس بات کی امید پر بیٹھے رہنا کہ بیرونی زور انسان کی یا قوم کی اصلاح و ترقی کرے۔ کس قدر افسوس بلکہ نادانی کی بات ہے۔ وہ شخص و حقیقت غلام نہیں ہے جس کو ایک ناخدا ترس نے جو اُس کا ظالم آقا کہلایا جاتا ہے خرید لیا ہے یا ایک ظالم اور خود مختار بادشاہ یا گورنمنٹ کی رعیت ہے بلکہ و حقیقت وہ شخص اصلی غلام ہے جو بد اخلاقی۔ خود غرضی۔ جہالت اور شرارت کا مطیع اور اپنی خود غرضی کی غلامی میں مبتلا اور قومی ہمدردی سے بے پروا ہے۔ وہ قومیں جو اس طرح دل میں غلام ہیں۔ وہ بیرونی زوروں سے یعنی عمدہ گورنمنٹ یا عمدہ قومی انتظام سے آزاد نہیں ہو سکتیں جب تک کہ غلامی کی یہ دلی حالت دور نہ ہو۔ چل یہ ہے کہ جب تک انسانوں میں خیال کہ ہماری اصلاح و ترقی گورنمنٹ پر یا قوم کے عمدہ انتظام پر منحصر ہے اس وقت تک کوئی مستقل اور برتاؤ میں آنے کے قابل نتیجہ اصلاح و ترقی کا قوم میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ گو ایسی ہی عمدہ تبدیلیاں گورنمنٹ یا انتظام میں کی جاویں۔ وہ تبدیلیاں فانوس خیال سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں جیسے طرح طرح کی تصویریں پھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ مگر جب دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔ مستقل اور مضبوط آزادی سچی عزت۔ اصلی ترقی۔ شخصی چال چلن کے عمدہ ہونے پر

منحصر ہے اور وہی شخصی چال چلن معاشرت و تمدن کا محافظ اور وہی شخصی
 چال چلن۔ قومی ترقی کا بڑا ضامن ہے۔ جان اسٹیورٹ مل جو اسی زمانہ
 میں ایک بہت بڑا دانا حکیم گزرا ہے اُسکا قول ہے کہ ”ظالم اور خود مختار
 حکومت بھی زیادہ خراب نتیجے پیدا نہیں کر سکتی اگر اُس کی رعایا میں شخصی
 اصلاح اور شخصی ترقی موجود ہے اور جو چیز کہ شخصی اصلاح و شخصی ترقی کو دیا
 دیتی ہے درحقیقت وہی شے اُس کے لئے ظالم و خود مختار گورنمنٹ ہے۔
 پھر اُس شے کو جس نام سے چاہو پکارو۔ اس مقولہ پر میں اس قدر اور زیادہ
 کرتا ہوں کہ جہاں شخصی اصلاح و شخصی ترقی مٹ گئی ہے یا دب گئی ہے
 وہاں کیسی ہی آزاد اور عمدہ گورنمنٹ کیوں نہ قائم کی جاوے وہ کچھ بھی عمدہ
 نتیجے پیدا نہیں کر سکتی اور اس اپنے مقولہ کی تصدیق کو ہندوستان کی
 اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کی مثال پیش کرتا ہوں۔
 اے مسلمان بھائیو کیا تمہاری یہی حالت نہیں ہے؟ تم نے اس عمدہ
 گورنمنٹ سے جو تم پر حکومت کر رہی ہے کیا فائدہ اٹھایا ہے؟ تمہاری
 آزادی کے محفوظ رکھنے کا تم کو کیا نتیجہ حاصل ہوا ہے؟ بیچ بیچ بیچ۔ اسکا
 سبب یہی ہے کہ تم میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ نہیں ہے۔ انسان
 کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں کہ کوئی خطرے گورنمنٹ
 فیاض ہو اور ہمارے سب کام کر دے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر چیز ہمارے

لئے کی جاوے اور ہم خود نہ کریں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اگر اس کو ہادی اور رہنما بنایا جاوے تو تمام قوم کی دلی آزادی کو برباد کر دے اور آدمیوں کو انسان پرست بنادے۔ حقیقت میں ایسا ہونا قوت کی پرستش ہے اور اُس کے نتائج انسان کو ایسا ہی حقیر بنا دیتے ہیں جیسے کہ صرف دولت کی پرستش سے انسان حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے۔ کیا لالہ اشرفی مل جو روزِ ٹھپی کی پوجا کرتے ہیں اور بے انتہا دولت رکھتے ہیں۔ انسانوں میں کچھ قدر و منزلت کے لائق گنے جاتے ہیں؟ بڑا سچا مسئلہ اور نہایت مضبوط۔ جس سے دنیا کی معزز قوموں نے عزت پائی ہے وہ اپنی آپ مدد کرنا ہے۔ جس وقت لوگ اُسکو اچھی طرح سمجھیں گے اور کام میں لاویں گے تو پھر خضر کو ڈھونڈنا بھول جاویں گے اور لوں پر بھروسہ اور اپنی مدد آپ۔ یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے بالکل خلاف ہیں۔ پچھلا انسان کی بدیوں کو برباد کرتا ہے اور پہلا خود انسان کو۔ قومی انتظام یا عمدہ قوانین کے اجرا کی خواہش یہ بھی ایک قدیمی غلط خیال ہے۔ سچا اصول وہ ہے جو ولیم ڈراگن نے ڈبلن کی نمائش گاہ دستکاری میں کہا تھا جو ایک بڑا خیر خواہ آئرلینڈ کا تھا۔ اُس نے کہا کہ ”جس وقت میں آزادی کا لفظ سنتا ہوں اُسی وقت مجھ کو میرا ملک اور میرے شہر کے باشندے یاد آتے ہیں۔ ہم اپنی آزادی کے لئے بہت سی باتیں سننے آئے ہیں مگر میرے دل میں بہت بڑا مضبوط یقین ہے کہ ہماری محنت۔ ہماری آزادی

ہمارے اوپر منحصر ہے، میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ہم محنت کئے جاویں اور اپنی قوتوں کو ٹھیک طور پر استعمال کریں تو اس سے زیادہ ہم کو کوئی موقع یا آئندہ کی قومی توقع اپنی بہتری کے لئے نہیں ہے۔ استقلال اور محنت کا میانی کا بڑا ذریعہ ہے اگر ہم دلی دلولہ اور محنت سے کام کئے جائینگے تو مجھے پورا یقین ہے کہ تھوڑے زمانہ میں ہماری حالت بھی ایک عمدہ قوم کے مانند آرام و خوشی و آزادی کی ہو جائیگی۔ انسان کی اگلی لپیٹوں کے حالات پر خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی موجودہ حالت انسانوں کی نسل در نسل کے کامیاب حاصل ہوئی ہے۔ محنتی اور مستقل مزاج محنت کرنے والوں۔ زمین کے چوتھے والوں۔ کانوں کے کھودنے والوں۔ نیئی نیئی باتوں کے ایجاد کرنے والوں۔ مخفی باتوں کو ڈھونڈ کر نکالنے والوں آلات جبر ثقیل سے کام لینے والوں اور ہر قسم کے پیشہ کرنے والوں۔ بہنر مندوں۔ شکاریوں۔ حکیموں۔ فیلسوفوں۔ ملکی منتظموں نے انسان کو موجودہ ترقی کی حالت پر پہنچانے میں بڑی مدد دی ہے۔ ایک نسل نے دوسری نسل کی محنت پر عمارت بنائی اور اسکو ایک اعلیٰ درجہ تک پہنچایا ہے۔ ان عمدہ کاریگروں سے جو تہذیب و شائستگی کی عمارت کے معمار ہیں لگاتار ایک دوسرے کے بعد ہونے سے محنت اور علم و ہنر میں ج ایک بے ترتیبی کی حالتیں تھے ایک ترتیب پیدا ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ پنجر کی گردش نے موجودہ نسل کو اس زرخیز اور بے بہا جائیداد کا وارث کیا ہے جو ہمارے پرکھوں کی ہوشیار اور محنت سے مہیا ہوئی تھی اور وہ جائیداد ہکواسلے نہیں دی گئی ہے کہ ہم صرف مثل اسرگ

اُسکی حفاظت ہی کیا کریں بلکہ ہلکا سٹلے دی گئی ہے کہ اُس کو ترقی دیں اور ترقی
 یافتہ حالت میں آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑ جا دیں مگر افسوس صد ہزار افسوس کہ
 ہماری قوم نے اُن پرکھوں کی چھیڑی ہوئی جائداد کو بھی گرا دیا۔ انگریزوں کو
 جو دنیا کے اس دور میں اس قدر ترقی ہوئی اُسکا سبب صرف یہی ہے کہ ہمیشہ
 انکی قوم میں اپنی مدد آپ کر نیکا جذبہ رہا ہے اور اُس قوم کی شخصی محنت اُسپر
 گواہ عادل ہے۔ یہی مسئلہ اپنی مدد آپ کرنے کا انگریزوں کی قوم کی طاقت
 کا سچا پیمانہ رہا ہے۔ انگریزوں میں اگرچہ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو
 تمام لوگوں سے اعلیٰ درجہ کے اور زیادہ مشہور تھے اور جن کی تمام لوگ عزت
 بھی کرتے تھے۔ لیکن کم درجہ کے اور غیر مشہور آدمیوں کے گروہوں میں سے
 بھی اُس قوم کو بڑی ترقی ہوئی ہے۔ گو کسی لڑائی اور میدان کارزار کی
 فہرستوں اور تاریخوں میں صرف بڑے بڑے جنرلوں اور سپہ سالاروں کے نام
 لکھے گئے ہوں۔ لیکن وہ فتوحات اُن کو زیادہ تر انھیں لوگوں کی شجاعت
 اور بہادری کے سبب سے ہوئی ہیں۔ عام لوگ ہی تمام زمانوں میں
 سب سے زیادہ کام کرنے والے ہوئے ہیں بہت سے ایسے شخص ہیں
 جن کی زندگی کا حال کسی نے نہیں لکھا۔ لیکن تہذیب و شائستگی اور ترقی
 پر اُن کا بھی ایسا ہی قوی اثر ہوا ہے جیسا کہ اُن خوش نصیب مشہور نامور
 آدمیوں کا ہوا ہے جن کی زندگی کے حالات مورخوں نے اپنی تاریخوں میں

لکھے ہیں۔ ایک نہایت عاجز و مسکین غریب آدمی جو اپنے ساتھیوں کو محنت
 اور پرہیزگاری اور بے لگاؤ ایمان داری کی نظر دکھاتا ہے اُس شخص کا اُس
 زمانے میں اور آئندہ زمانے میں اُس کے ملک اُسکی قوم کی بھلائی پر بہت
 بڑا اثر پیدا ہوتا ہے کیونکہ اُس کی زندگی کا طریقہ اور چال چلن کو معلوم نہیں
 ہوتا مگر اور شخصوں کی زندگی میں خفیہ خفیہ پھیل جاتا ہے اور آئندہ کی نسل
 کے لئے ایک عمدہ نظیر بن جاتا ہے۔ ہر روز کے تجربہ سے یہ بات معلوم ہوتی
 ہے کہ شخصی ہی چال چلن میں یہ قوت ہے کہ دوسرے کی زندگی اور برتاؤ
 اور چال چلن پر نہایت قوی اثر پیدا کرتا ہے اور حقیقت میں یہی ایک
 نہایت عمدہ عملی تعلیم ہے اور جب ہم اس عملی تعلیم کا علمی تعلیم سے مقابلہ کریں
 تو مکتب و مدرسہ اور مدرسۃ العلوم کی تعلیم اس عملی تعلیم کی ابتدائی تعلیم
 معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کے علم کا یعنی زندگی کے برتاؤ کے علم کا جس کو
 انگریزی میں ”لیف ایجوکیشن“ کہتے ہیں انسان پر۔ قوم پر بہت زیادہ
 اثر ہوتا ہے۔ مکتب و مدرسہ و مدرسۃ العلوم کا علم طاق یا صندوق یا الماری
 میں یا کسی بڑے کتب خانہ میں رکھا ہوا ہوتا ہے مگر زندگی کے برتاؤ
 کا علم ہر وقت دوست سے ملنے میں گھر کے رہنے سننے میں۔ شہر کی گلیوں
 میں پھرنے میں صرافہ کی دوکان کرنے میں، ہل جوتنے میں۔ کپڑا بننے کے
 کارخانہ میں گلوں سے کام کرنے کے کارخانے میں اپنے ساتھ ہی ہوتا

ہے اور پھر بے سکھائے اور بے شاگرد کئے لوگوں میں صرف اُس کے برتاؤ سے پھیلتا جاتا ہے۔ یہ پچھلا علم وہ علم ہے جو انسان کو انسان بناتا ہے۔ اسی پچھلے علم سے عمل۔ چال چلن۔ تعلیم نفسی۔ نفس کشی۔ شخصی خوبی۔ قومی مضبوطی قومی عزت حاصل ہوتی ہے۔ یہی پچھلا علم وہ علم ہے کہ جو انسان کو اپنے فرائض ادا کرنے اور دوسروں کے حقوق محفوظ رکھنے اور زندگی کے کاروبار کرنے اور اپنی عاقبت کے سنوارنے کے لائق بنا دیتا ہے۔ اس علم کو آدمی صرف کتابوں سے نہیں سیکھ سکتا اور نہ یہ تعلیم کسی درجے کی علمی تحصیل سے حاصل ہوتی ہے۔ لارڈ بیکن کا منایت عمدہ قول ہے کہ ”علم سے عمل نہیں آجاتا۔ علم کو عمل میں لانا علم سے باہر اور علم سے برتر ہے اور مشاہدہ آدمی کی زندگی کو درست اور اُس کے علم کو باعمل یعنی اُس کے برتاؤ میں داخل کر دیتا ہے۔ علم کی بہ نسبت عمل اور سوانح عمیری کی بہ نسبت عمدہ چال چلن آدمی کو زیادہ تر معزز اور قابلِ دب بنا دیتا ہے۔“ کیا یہی وجہ ہے جو مدرسۃ العلوم مسلمان کے بانیوں نے یہ تجویز کی ہے کہ مسلمانوں کے لڑکے گھروں سے اور بد صحبتوں سے علیحدہ مدرسۃ العلوم میں عالموں اور اشرافوں اور تربیت یافتہ لوگوں کی صحبت میں رکھے جاویں؟

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی

پیدائش اعظم گڑھ ۱۲۵۷ھ

اعظم گڑھ آپ کا وطن ہے۔ ابتدائی تعلیم اسی ضلع میں پانی پھر غازی پور میں مولوی محمد فاروق صاحب چڑیا کوٹی سے معقولات و فلسفہ پڑھا۔ زان بعد سسارن پور میں مولانا احمد علی محدث سے حدیث پڑھی۔ اسی اثنا میں آپ حج کو تشریف لے گئے۔ حج سے واپس آکر لاہور میں ادب کی تحصیل کی۔ تحصیل علم سے فارغ ہو کر کچھ دن سرکاری نوکری اور پھر وکالت کی۔ لیکن یہ پیشہ طبیعت کے خلاف تھا اس لئے چھوڑ دیا۔ ۱۲۷۷ھ میں مولانا شبلی علی گڑھ میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ اسی زمانہ میں آپ نے ٹرکی پھر دشام کا سفر کیا۔ اس سفر سے واپس آنے پر گورنمنٹ سے آپ کو شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا۔ سولہ برس کی ملازمت کے بعد علی گڑھ کالج چھوڑ کر مولانا خانہ نشین ہو گئے لیکن چند ہی روز بعد حیدر آباد میں ناظم علوم و فنون کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ چار برس تک حیدر آباد میں رہے، مگر یہ معلوم کر کے کہ ندوۃ العلماء کی حالت خراب ہے، استعفا دیکر چلے آئے۔ آج کل آپ لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کے انزیری سکریٹری ہیں اور اس خدمت کو احسن طریقہ سے انجام دے رہے ہیں۔ حیدر آباد

میں جو منصب مقرر ہوا اتحادہ اب تک قائم ہے۔

مولانا شبلی سے اردو نثر میں اکثر تصانیف یادگار ہیں۔ الفاروق
 المامون۔ الجزیرہ۔ رسائل شبلی۔ خاص کر اسلامی مضامین سے متعلق ہیں اور
 اُن سے آپ کے تاریخی ذوق و تحقیقات کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے علاوہ
 سفرنامہ روم و مصر و شام۔ سوانح عمری مولانا روم۔ موازنہ انیس و دہر
 شعر الجم۔ ایسی کتابیں ہیں جن سے ہر مذہب و ملت کے لوگ یکساں
 فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مولانا شبلی اُن معدودے چند مصنفوں میں ہیں
 جنہوں نے کریٹی سزم کے اصلی مفہوم کو سمجھا ہے اور کوشش کی ہے کہ
 تنقید کا حق اردو میں بھی ادا کیا جائے۔ آپ کا طرز تحریر سلیس پُر زور
 اور دلپذیر ہے۔ شعر اردو اور فارسی دونوں میں کہتے ہیں اردو نظم
 میں مثنوی صبح اُسید آپ سے یادگار ہے۔

شاعری

ماخوذ از شعربم حبلہ دم

شاعر کی حقیقت | شاعری چونکہ وجدانی اور ذوقی چیز ہے اس لئے اس کا کلام
 اور مانع تعریف چند الفاظ میں نہیں کی جاسکتی اس بنا پر مختلف طریقوں سے

اسکی حقیقت کا سمجھنا زیادہ مفید ہوگا کہ ان سب کے مجموعہ سے شاعری کا ایک صحیح نقشہ پیش نظر ہو جائے۔

خدا نے انسان کو مختلف اعضا اور مختلف قوتیں دی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے فرائض اور تعلقات الگ ہیں۔ ان میں سے دو قوتیں تمام افعال اور ارادات کا سرچشمہ ہیں ادراک اور احساس ادراک کا کام اشیا کا معلوم کرنا اور استدلال اور استنباط سے کام لینا ہے۔ ہر قسم کے ایجادات۔ تحقیقات۔ انکشافات اور تمام علوم و فنون اسی کے نتائج عمل ہیں۔

احساس کا کام کسی چیز کا ادراک کرنا یا کسی مسئلہ کا حل کرنا یا کسی بات پر غور کرنا اور سوچنا نہیں ہے اس کا کام صرف یہ ہے کہ جب کوئی موثر واقعہ پیش آتا ہے تو وہ متاثر ہو جاتا ہے غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے خوشی میں سرور ہوتا ہے حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے یہی قوت جس کو احساس افعال۔ یا فیلنگ سے تعبیر کر سکتے ہیں شاعری کا دوسرا نام ہے۔ یعنی یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔

حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو مختلف قسم کی آوازوں یا حرکتوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً شیر گونجتا ہے مور چٹھارتے ہیں کونسل کو کہتی ہے ہلاؤس ناچتا ہے سیانپ لہراتے ہیں انسان کے جذبات بھی حرکات کے ذریعہ سے ادا ہوتے ہیں لیکن اس کو جانوروں سے

بڑھ کر ایک اور قوت دی گئی ہے یعنی نطق اور گویائی اس لئے جب اس پر کوئی قوی جذبہ طاری ہوتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے موزوں الفاظ نکلتے ہیں، اسی کا نام شعر ہے۔

اب منطقی پیرایہ میں شعر کی تعریف کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں وہ شعر ہیں اور چونکہ یہ الفاظ سامعین کے جذبات پر بھی اثر کرتے ہیں یعنی سننے والوں پر بھی وہی اثر طاری ہوتا ہے جو صاحب جذبہ کے دل پر طاری ہوتا ہے اس لئے شعر کی تعریف یوں بھی کر سکتے ہیں کہ جو کلام انسانی جذبات کو براہِ انگیزہ کرے اور ان کو تحریک میں لاوے وہ شعر ہے۔

ایک یورپین مصنف لکھتا ہے کہ ”ہر چیز جو دل پر استعجاب یا حیرت یا جوش یا اور کسی قسم کا اثر پیدا کرتی ہے شعر ہے“ اس بنا پر فلک نیلگوں، نجم درخشاں، نسیم سحر گلگونہ شفق، تبسم گل، خرام صبا، نالہ بلبل، ویرانی دشت شادابی چین، غرض تمام عالم شعر ہے۔ یہ آج کل کا خیال ہے لیکن عجیب بات ہے کہ حضرت خواجہ فرید الدین عطار نے آج سے چھ سو برس پہلے کہا تھا۔ ع

پس جہاں شاعر بود چوں دیگران

جو چیزیں دل پر اثر کرتی ہیں بہت سی ہیں مثلاً موسیقی مصوری

صنعت گری وغیرہ لیکن شاعری کی اثر انگیزی کی حد سب سے زیادہ وسیع ہے۔ موسیقی صرف قوت سامعہ کو محفوظ کر سکتی ہے۔ سامعہ نہ ہو تو وہ کچھ کام نہیں کر سکتی تصویر سے متاثر ہونے کے لئے بنیائی شرط ہے۔ لیکن شاعری تمام حواس پر اثر ڈال سکتی ہے۔ باصرہ۔ ذائقہ۔ شامہ۔ لامہ۔ سب اس سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔ فرض کرو شراب آنکھوں کے سامنے نہیں ہے اس لئے آنکھ اس وقت اس سے حظ نہیں اٹھا سکتی لیکن جب ایک شاعر اس کو آتش سیال سے تعبیر کرتا ہے تو ان الفاظ سے ایک موثر منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔

کسی چیز کی حقیقت اور ماہیت کے تعین کرنے کا آسان علمی طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کا کوئی نمایاں وصف لیا جائے پھر یہ دیکھا جائے کہ اس وصف میں اور کیا کیا چیزیں اس کے ساتھ شریک ہیں پھر ان صفات کو ایک ایک کر کے متعین کیا جائے جن کی وجہ سے یہ چیز اپنی اور ہم جنس چیزوں سے الگ اور ممتاز ہوتی گئی ہے۔

اس قدر سب تسلیم کرتے ہیں کہ شعر کا نمایاں وصف جذبات انسانی کا براہِ انگیزہ کرنا ہے یعنی اس کو سُکر دل میں رنج یا خوشی یا جوش کا اثر پیدا ہوتا ہے یہ خصوصیت شاعری کو سائنس اور علوم و فنون سے ممتاز کر دیتی

۱۵ یہ تمام تقریریں مل صاحب کے مضمون سے ماخوذ ہے۔

ہے شاعری کا مخاطب جذبات سے ہے اور سائنس کا یقین ہے۔ سائنس استدلال سے کام لیتا ہے اور شاعری محرکات کو استعمال کرتی ہے۔ سائنس عقل کے سامنے کوئی علمی مسئلہ پیش کرتا ہے۔ لیکن شاعری احساسات کو دلکش منظر دکھاتی ہے۔ لیکن یہ خاصیت موسیقی تصویر بلکہ مناظر قدرت میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس لئے کلام یا الفاظ کی قید لگانا چاہئے کہ یہ چیزیں بھی اس دائرہ سے نکل جائیں تاہم خطبہ (لکچر) تاریخ افسانہ اور ڈراما شاعری کی حد میں داخل رہیں گی ان میں اور شعر میں حد فاصل قائم کرنا مشکل ہے زیادہ دقت اس لئے ہوتی ہے کہ اکثر اعلیٰ نظمیں افسانہ کی شکل میں ہوتی ہیں اور اکثر افسانوں میں شاعری کی روح پائی جاتی ہے اس لئے دونوں جب باہم مل جاتے ہیں تو ان میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ افسانہ اُسی حد تک افسانہ ہے جہاں تک اس میں خارجی واقعات اور زندگی کی تصویر ہوتی ہے جہاں سے اندرونی جذبات اور احساسات شروع ہوتے ہیں وہاں شاعری کی سرحد آجاتی ہے۔ افسانہ نگار بیرونی اشیاء کا استقصا کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے۔ بخلاف اس کے شاعر اندرونی جذبات اور احساسات کی نیلگیوں کا ماہر بلکہ تجربہ کار ہوتا ہے۔

تاریخ اور شعر کا فرق ایک مثال کے ذریعہ سے اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔ ایک شخص جنگل میں جا رہا ہے کسی گوشہ سے ایک میب شیر ڈکارتا ہوا

نکلا اس کی پر عجب گونج بھیا نک چہرہ شگین آنکھوں نے اس شخص کے
دل کو لرزادیا یہ شخص کسی کے سامنے شیر کا حلیہ اور شکل و صورت جن موثر
لفظوں میں بیان کرے گا وہ شعر ہے۔

علم الحیوانات کا ایک عالم کسی عجائب خانہ میں جاتا ہے وہاں ایک شیر
کٹہرہ میں بند ہے۔ یہ عالم شیر کے ایک ایک عضو کو علمی حیثیت سے دیکھتا
ہے اور علمی طریقہ سے کسی مجمع کے سامنے شیر پر لکچر دیتا ہے یہ سائنس یا
تاریخ یا واقعہ نگاری ہے۔

شاعری کے اقسام میں ایک قسم واقعہ نگاری ہے یعنی شاعر خارجی
واقعات کی تصویر کھینچتا ہے لیکن اس حیثیت سے نہیں کہ فی نفسہ وہ
کیا ہیں بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ ہمارے جذبات پر کیا اثر ڈالتی ہیں۔
شاعر ان اشیاء کے سادہ خط و خال کی تصویر نہیں کھینچتا بلکہ ان میں تو
تخیل کا رنگ بھرتا ہے تاکہ موثر بن جائے۔

اس تقریر سے شاعری اور واقعہ نگاری کا فرق واضح ہو جاتا ہے
لیکن خطابت اور شاعری کی حد فاصل اب بھی نہیں قائم ہوئی خطابت
میں بھی شاعری کی طرح جذبات اور احساسات کا برانگیختہ کرنا مقصود
ہوتا ہے لیکن حقیقت میں شاعری اور خطابت بالکل جدا جدا چیزیں
ہیں خطابت کا مقصود حاضرین سے خطاب کرنا ہوتا ہے اسپیکر حاضرین

کے مذاق معتقدات اور میلان طبع کی جستجو کرتا ہے تاکہ اس کے لحاظ سے تقریر کا ایسا پیرایہ اختیار کرے جس سے ان کے جذبات کو براہِ نیغہ کر سکے اور اپنے کام میں لائے بخلاف اس کے شاعر کو دوسروں سے غرض نہیں ہوتی وہ یہ نہیں جانتا کہ کوئی اس کے سامنے ہے بھی یا نہیں؟ اس کے دل میں جذبات پیدا ہوتے ہیں وہ بے اختیار ان جذبات کو ظاہر کرتا ہے۔ جس طرح درد کی حالت میں بے ساختہ آہ نکل جاتی ہے، بے شبہ یہ اشعار اوروں کے سامنے پڑھے جائیں تو ان کے دل پر اثر کریں گے لیکن شاعر نے اس غرض کو پیش نظر نہیں رکھا تھا۔ جس طرح کوئی شخص اپنے عزیز کے مرنے پر نوحہ کرتا ہے تو اس کی یہ غرض نہیں ہوتی کہ لوگوں کو سناے لیکن اگر کوئی شخص سن لے تو ضرور تڑپ جائیگا۔

اصلی شاعر وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو لیکن جو لوگ بہ تکلف شاعر بتے ہیں اُن کا بھی فرض ہے کہ ان کے اندازِ کلام سے مطلق نہ پایا جائے کہ وہ سامعین کو مخاطب کرنا چاہتے ہیں ایک ایکٹر کو خوب معلوم ہے کہ بہت سے حاضرین اس کے سامنے موجود ہیں لیکن اگر ایکٹ کرنے کی حالت میں وہ اس علم کا اظہار کر دے تو سارا پارٹ غارت ہو جائیگا۔ شاعر اگر اپنے نفس کے بجائے دوسروں

سے خطاب کرتا ہے دوسروں کے جذبات کو ابھارنا چاہتا ہے جو کچھ کہتا ہے جو کچھ کہتا ہے اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے کہتا ہے تو شاعر نہیں بلکہ خطیب ہے۔ اس سے یہ واضح ہو گا کہ شاعری تنہا نشینی اور مطالعہ نفس کا نتیجہ ہے بخلاف اس کے خطابت لوگوں سے ملنے جلنے اور راہ و رسم رکھنے کا ثمرہ ہے اگر ایک شخص کے اندر کئی احساسات تیز اور مشتعل ہیں تو وہ شاعر ہو سکتا ہے لیکن خطیب کے لئے ضرور ہے کہ دوسروں کے جذبات اور احساسات کا نیا ضمیمہ شاعری کے اصلی | ایک عمدہ شعر میں بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں اس میں عنان کیا ہیں؟ وزن ہوتا ہے محاکات ہوتی ہے یعنی کسی چیز یا کسی حالت کی تصویر کھینچی جاتی ہے خیال بندی ہوتی ہے۔ الفاظ سادہ اور شیریں ہوتے ہیں بندش صاف ہوتی ہے طرز ادا میں جدت ہوتی ہے لیکن کیا یہ سب چیزیں شاعری کے اجزا ہیں؟ کیا ان میں سے ہر ایک ایسی چیز ہے؟ اگر وہ نہ ہوتی تو شعر شعر نہ ہوتا اگر ایسا نہیں ہے اور قطعاً نہیں ہے تو ان تمام اوصاف میں خاص ان چیزوں کو متعین کر دینا چاہئے جن کے بغیر شعر شعر نہیں رہتا۔ عام لوگوں کے نزدیک یہ چیز وزن ہے اسی لئے عام لوگ کلام موزوں کو شعر کہتے ہیں لیکن محققین کی یہ رائے نہیں وہ وزن کو شعر کا ایک ضروری جزو سمجھتے ہیں تاہم ان کے نزدیک وہ شاعری کا اصل عنصر نہیں ہے۔

ارسطو کے نزدیک یہ چیز محاکات یعنی مصوری ہے لیکن یہ بھی بھی صحیح نہیں اگر کسی شعر میں تخیل ہو اور محاکات نہ ہو تو کیا وہ شعر نہ ہوگا؟ سیکڑوں اشعار ہیں جن میں محاکات کے بجائے صرف تخیل ہے اور باوجود اس کے وہ عمدہ شعر خیال کئے جاتے ہیں شاید یہ کہا جائے کہ محاکات ایسا وسیع مفہوم ہے کہ تخیل اس کے دائرہ سے باہر نہیں جاسکتی۔ اسلئے تخیل بھی محاکات ہے لیکن یہ زبردستی ہے آگے چل کر جب ہم محاکات اور تخیل کی تعریف لکھیں گے تو واضح ہو جائیگا کہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں گو یہ ممکن ہے کہ بعض مثالوں میں دونوں کی سرحدیں مل جائیں حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے۔ محاکات اور تخیل نہیں سے ایک بات بھی پائی جاوے تو شعر شعر کہلانے کا مستحق ہوگا باقی اور اوصاف یعنی سلاست، صفائی، حسن بندش وغیرہ وغیرہ شعر کے اجزائے اصلی نہیں بلکہ عوارض اور مستحقات ہیں۔

محاکات کی تعریف | محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ تصویر اور محاکات میں یہ فرق ہے کہ تصویر میں اگرچہ مادی اشیاء کے علاوہ حالات یا جذبات کی بھی تصویر کھینچی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اعلیٰ درجہ کے مصوّر انسان کی ایسی تصویر کھینچ سکتے ہیں کہ چہرہ سے جذبات انسانی مثلاً رنج، خوشی، تفکر، حسرت، استعجاب پریشانی اور بیتابی ظاہر ہو

جوانگیر کے سامنے ایک مصوّر نے ایک عورت کی تصویر پیش کی تھی جس کے تلوے
 سہلائے جا رہے ہیں۔ تلووں کے سہلاتے وقت چہرہ پر گدگدی کا جو اثر
 طاری ہوتا ہے وہ تصویر کے چہرہ سے نمایاں تھا تاہم تصویر ہر جگہ محاکات
 کا ساتھ نہیں دے سکتی سیکڑوں گوناگوں واقعات، حالات اور واردات
 ہیں جو تصویر کی دسترس سے باہر ہیں مثلاً قافیہ کا ایک موقع پر بے کاسمل کھانا
 زمک زمک نسیم زیر گلاں می خرد غنچہ ایس می مکہ عارض آں می مزد
 سنبل ایس می کشد گردن آں می گزد گہ بہ چمن می چہ گہ بہ سن می وز د

۷۷ ہ شاخ درخت گہ بہ لب جو سبار

یعنی ہلکی ہلکی ہوا آئی پھولوں میں گھسی کسی پھول کا گال چوم لیا کسی کی
 ٹھوڑی چوس لی کسی کے بال کھینچے کسی کی گردن دانت سے کاٹی۔ کیا ریو
 میں کھیلے کھیلے چنبیلی کے پاس پہونچی اور درخت کی ٹہنیوں میں ہوتی ہوئی
 نہر کے کنارے پہونچ گئی۔ اس سماں کو مصوّر تصویر میں کیونکر دکھا سکتا ہے ؟
 یہ تو مادی اشیائیں خیالات۔ جذبات اور کیفیات کا ادا کرنا اور زیادہ
 مشکل ہے۔ تصویر اس سے کیونکر عمدہ برآ ہو سکتی ہے مثلاً اس شعر میں -

نسب نامہ دولت کی قباد ورق بر ورق ہر سو بردباد

یہ خیال ادا کیا گیا ہے کہ دارا کے مرنے سے کیا فی خاندان بالکل
 برباد ہو گیا۔ یہ خیال تصویر کے ذریعہ سے کیونکر ادا ہو سکتا ہے x x x

ایک بڑا فرق عام مصوری اور شاعرانہ مصوری میں یہ ہے کہ تصویر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے اُس کا ایک ایک خال خط دکھایا جائے ورنہ تصویر نا تمام اور غیر مطابق ہوگی بخلاف اس کے شاعرانہ مصوری میں یہ التزام ضروری نہیں شاعر اکثر صرف اُن چیزوں کو لیتا ہے اور اُن کو نمایاں کرتا ہے جن سے ہمارے جذبات پر اثر پڑتا ہے، باقی چیزوں کو وہ نظر انداز کرتا ہے یا اُن کو دھندلا رکھتا ہے کہ اثر اندازی میں اُن سے خلل نہ آئے فرض کرو کہ ایک پھول کی تصویر کھینچی ہو تو مصور کا کمال یہ ہے کہ ایک ایک ٹکڑی اور ایک ایک رگ وریشہ دکھائے لیکن شاعر کے لئے غزوری نہیں ممکن ہے کہ وہ ان چیزوں کو اجمالی اور غیر نمایاں صورت میں دکھائے تاہم مجموعہ سے وہ اثر پیدا کر دے جو اصلی پھول کے دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔

ایک اور بڑا فرق مصوری اور محاکات میں یہ ہے کہ مصوری کسی چیز کی تصویر کھینچنے سے زیادہ سے زیادہ وہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو خود اس چیز کو دیکھنے سے پیدا ہوتا لیکن شاعر باوجود اسکے کہ تصویر کا ہر جزو نمایاں کر کے نہیں دکھاتا تاہم اس سے زیادہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو اصل چیز کے دیکھنے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ سبزہ پر شبنم دیکھ کر وہ اثر نہیں پیدا ہو سکتا جو اس شعر سے ہو سکتا ہے
 کھا کھا کے اوس اور بھی سبز ہوا تھا موتیوں سے دامن صحرابھرا ہوا

تصویر کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو اور اگر مصوّر اس امر میں کامیاب ہو گیا تو اسکو کامل فن کا خطاب مل سکتا ہے۔ لیکن شاعر کو اکثر موقعوں پر دو شکل مرحلوں کا سامنا ہوتا ہے یعنی نہ اصل کی پوری پوری تصویر کھینچ سکتا ہے کیونکہ بعض جگہ اس قسم کی پوری مطابقت احساسات کو بختم نہیں کر سکتی نہ اصل سے زیادہ دور ہو سکتا ہے ورنہ اس پر اعتراض ہو گا کہ صحیح تصویر نہیں کھینچی۔ اس موقع پر اس کو تخیل سے کام لینا پڑتا ہے وہ ایسی تصویر کھینچتا ہے جو اصل سے آب و تاب اور حسن و جمال میں بڑھ جاتی ہے لیکن وہ قوت تخیل سے سامعین پر یہ اثر ڈالتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے۔ لوگوں نے اس کو امعان نظر سے نہیں دیکھا تھا اس لئے اس کا حسن پورا نمایاں نہیں ہوا تھا۔

تخیل | تخیل کی تعریف مہرے لوئس نے یہ کی ہے ”وہ قوت جس کا یہ کام ہے کہ ان اشیاء کو جو مرئی نہیں ہیں یا جو ہمارے حواس کی کسی کی وجہ سے ہم کو نظر نہیں آتیں ہماری نظر کے سامنے کر دے“ لیکن یہ تعریف پوری جامع اور مانع نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی چیزوں کی منطقی جامع اور مانع تعریف ہو بھی نہیں سکتی۔

تخیل دراصل قوت اختراع کا نام ہے۔ عام لوگوں کے نزدیک منطق یا فلسفہ کا موجد صاحب تخیل نہیں کہا جاسکتا بلکہ اگر خود کسی فلسفہ داں کو

اس لقب سے خطاب کیا جائے تو اُسکو عار آئے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ اور شاعری میں قوت تخیل کی یکساں ضرورت ہے۔ یہی قوت تخیل ہے جو ایک طرف فلسفہ میں ایجاد اور اکتشاف مسائل کا کام دیتی ہے اور دوسری طرف شاعری میں شاعرانہ مضامین پیدا کرتی ہے چونکہ اکثر سائنس دان شاعری کا مذاق نہیں رکھتے اور شعرا فلسفہ اور سائنس سے نا مانوس ہوتے ہیں اس لئے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ قوت تخیل کو فلسفہ اور سائنس سے تعلق نہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ بے شبہ علم سائنس یا فلسفہ جانتے والے جن میں قوت ایجاد نہیں قوت تخیل نہیں رکھتے لیکن جو لوگ کسی مسئلہ یا فن کے موجد ہیں۔ انکی قوت تخیل سے کون انکار کر سکتا ہے۔ نیوٹن اور ارسطو میں اسی قدر زبردست قوت تخیل تھی جس قدر ہومر اور فردوسی میں البتہ دونوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں اور دونوں کی قوت تخیل کے استعمال کا طریقہ الگ الگ ہے۔ فلسفہ اور سائنس میں قوت تخیل کا استعمال اس غرض سے ہوتا ہے کہ ایک علمی مسئلہ حل کر دیا جائے۔ لیکن شاعری میں تخیل سے یہ کلام لیا جاتا ہے کہ جذبات انسانی کو تحریک ہو۔ فلسفی کو صرف ان موجودات سے غرض ہے جو واقع میں موجود ہیں۔ بخلاف اسکے شاعر ان موجودات سے بھی کام لیتا ہے جو مطلق موجود نہیں۔ فلسفہ کے دربار میں ہما۔ سیرغ۔ گادزمن۔ تخت سلیمان کی مطلق قدر نہیں۔

لیکن یہی چیزیں ایوان شاعری کی نقش و نگار ہیں فلسفی کی زبان سے اگر
 سیرِ غریب رزیں پر کا لفظ نکل جائے تو ہر طرف سے نبوت کا مطالبہ ہوگا لیکن
 شاعر اس قسم کے فرضی مخلوقات سے اپنا عالم خیال آباد کرتا ہے اور کوئی
 اس سے نبوت کا طالب نہیں ہوتا کیونکہ فلاسفر کی طرح وہ کسی مسئلہ کی تعلیم
 کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ وہ ہم کو صرف خوش کرنا چاہتا ہے اور بے شبہ وہ اس میں
 کامیاب ہوتا ہے ایک پھول کو دیکھ کر سائنس دان تحقیقات کرنا چاہتا ہے
 کہ وہ نباتات کے کس خاندان سے ہے۔ اسکے رنگ میں کن رنگوں کی آمیزش
 ہے۔ اسکی غذا زمین کے کن اجزاء سے ہے۔ اس میں نر و مادہ دونوں کے اجزاء
 ہیں یا صرف ایک کے؟ لیکن شاعر کو ان چیزوں سے غرض نہیں بچھو دیکھ کر
 اس کو بے اختیار یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ ع

ای گل بہ تو خرسندم تو بولے کسے داری

چاند کی نسبت ایک ہیئتِ دال کو ان مسائل سے غرض ہے کہ وہ کن عناصر
 سے بنا ہے؟ آباد ہے یا ویران؟ روشن ہے یا تاریک؟ سمندر کے مد و جزر
 سے اسکو کیا تعلق ہے؟ وغیرہ وغیرہ لیکن شاعر کو چاند سے صرف یہ غرض
 ہے کہ وہ معشوقِ کاروے روشن ہے شاعر کے سامنے (قوتِ تخیل کی
 بدولت) تمام بے حس اشیاء جاندار چیزیں بن جاتی ہیں سکے کانوں میں ہر طرف
 سے خوش آئند صدائیں آتی ہیں زمین۔ آسمان۔ ستارے بلکہ ذرہ ذرہ

اس سے باتیں کرتا ہے + + +

محاکات کی تکمیل کن (۱) محاکات جب موزوں کلام کے ذریعہ سے کیجائے
کن چیزوں سے ہوتی ہے تو سب سے پہلے وزن کا تناسب شرط ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ درد و غم، رنج و جوش، غیظ و غضب ہر ایک کے اظہار کا لہجہ اور آواز مختلف ہے اسلئے جس جذبہ کی محاکات مقصود ہو تو شعور کا وزن بھی اسی کے مناسب ہونا چاہئے تاکہ اس جذبہ کی پوری حالت ادا ہو سکے مثلاً فارسی میں بحر اقارب جس شاہ نامہ ہے رزمیہ خیالات کے لئے موزوں ہے۔ چنانچہ فارسی میں بحر رزمیہ مثنویاں لکھی گئیں سب اسی بحر میں لکھی گئیں۔ اسی طرح غزل و عاشقی کے خیالات کے لئے خاص خاص بحر ہیں۔ ان خیالات کو قصیدہ کی بحروں میں ادا کیا جائے تو تاثیر گھٹ جاتی ہے۔

(۲) محاکات کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو یعنی جس چیز کا بیان کیا جائے اس طرح کیا جائے کہ خود وہ شے مجسم ہو کر سامنے آجائے شاعری کا اصلی مقصد طبیعت کا انبساط ہے۔ کسی چیز کی اصلی صورت کھینچنا خود طبیعت میں انبساط پیدا کرتا ہے (وہ شے اچھی یا بُری ہے اس سے غرض نہیں) مثلاً چھپکلی ایک بد صورت جانور ہے جسکو دیکھ کر نفرت ہوتی ہے لیکن اگر ایک استاد مصور چھپکلی کی ایسی تصویر کھینچ دے کہ بال برابر فرق نہ ہو تو اس کے دیکھنے سے خواہ مخواہ لطف آئیگا۔ اسکی یہی

وجہ ہے کہ نقل کا اصل سے مطابق ہونا خود ایک موثر چیز ہے اب اگر وہ چیزیں جنکی محاکات مقصود ہے خود بھی دلاویز اور لطیف انگیز ہوں تو محاکات کا اثر بہت بڑھ جائیگا۔

(۳) اکثر چیزیں اس قسم کی ہیں کہ ان کے مختلف انواع ہوتے ہیں اور ہر نوع میں الگ خصوصیت ہوتی ہے مثلاً آواز ایک عام چیز ہے اسکی مختلف نوعیں ہیں پست بلند شیریں کمرخت سُر پلّی وغیرہ وغیرہ ذوقی چیزوں میں یہ فرق اور نازک ہو جاتا ہے مثلاً معشوق کی ادا ایک عام چیز ہے لیکن الگ الگ خصوصیتوں کی بنا پر لکے جدا جدا نام ہیں یعنی ناز و عشوہ غمزہ شوخی دنیا کی جو زبانیں وسیع اور لطیف ہیں ان میں ان دقیق فرقوں کی بنا پر ہر چیز کے لئے الگ الگ الفاظ پیدا ہو جاتے ہیں۔

اب جب کسی چیز کی محاکات مقصود ہو تو ٹھیک وہی الفاظ استعمال کرنے چاہئیں جو ان خصوصیات پر داخل کرتے ہیں۔ ساودمی نے ایک نظم لکھی تھی جبکاشان نزول یہ ہے کہ اس سے اُس کے کم سن بچے نے پوچھا کہ ”سیلاب کیونکر آتا ہے“ ساودمی نے اس کے جواب میں یہ نظم لکھی اور دکھایا کہ سیلاب کس طرح آہستہ آہستہ شروع ہوتا ہے اور کس طرح بڑھتا جاتا ہے اس نظم میں تمام الفاظ اس قسم کے آئے ہیں کہ پانی کے بننے گرنے پھیلنے پڑھنے (وغیرہ وغیرہ) کے وقت جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں الفاظ

کے لہجے سے انکا اظہار ہوتا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص خوش ادائی سے اس نظم کو پڑھے تو سننے والے کو معلوم ہو گا کہ زور شور سے سیلاب بڑھتا چلا آتا ہے۔
 تخیل کی تفصیلی بحث | اگرچہ محاکات اور تخیل دونوں شعر کے عنصر ہیں لیکن حقیقت

یہ ہے کہ شاعری دراصل تخیل کا نام ہے محاکات میں جو جان آتی ہے تخیل ہی سے آتی ہے ورنہ خالی محاکات انقالی سے زیادہ نہیں۔ قوت محاکات کا یہ کام ہے کہ جو کچھ دیکھے یا سنے اُسکو الفاظ کے ذریعہ سے بعینہ ادا کر دے لیکن ان چیزوں میں ایک خاص ترتیب پیدا کرنا مناسب اور توافق کو کام میں لانا پرآب و رنگ چڑھانا قوت تخیل کا کام ہے۔ قوت تخیل مختلف صورتوں میں عمل کرتی ہے شاعری کی نظر میں عالم کائنات قوت تخیل سے ایک اور عالم بن جاتا ہے۔ ہم کائنات کی دو قسمیں کرتے ہیں حساس اور غیر حساس لیکن شاعری کی عالم تخیل کا ذرہ ذرہ جاندار اور ہوش و عقل و جذبات سے لبریز ہے۔ آفتاب مابتاب بتارے صبح و شام شفق باغ بھول پتے سب اس سے ہم زبان کرتے ہیں سب اس کے راز دار ہیں اور سب سے اس کے تعلقات ہیں * * * اس عالم میں شاعر کی تاریخ زندگی عجب دلچسپیوں سے بھری ہوتی ہے۔ بلبل نے اسی عالم میں اس سے زمزمہ سنجی کی تعلیم پائی ہے۔ پروانے اس کے ساتھ کھیلے ہوئے ہیں شمع سے رات رات بھروہ سوز دل کتنا رہا ہے۔ نسیم سحری کو اکثر اس نے قاصد بنا کر محبوب کے یہاں بھیجا ہے۔ بارہا اس

غنیہ کی عین اس وقت پر وہ درسی کی جیب وہ مشوق کا تبسم چرا ہا تھا۔
 شاعر کا احساس نہایت لطیف تیز اور متعل ہوتا ہے عام لوگوں کے جذبات
 بھی خاص حالتوں میں متعل ہو جاتے ہیں اور اس وقت وہ بھی مظاہر قدرت سے
 اسی طرح خطاب کرنے لگتے ہیں خیال کرو ایک عورت جس کا جوان بیٹا مر گیا
 ہے کس کس طرح موت کو آسمان کو زمین کو کو سے دیتی ہے کس طرح ان سے
 خطاب کرتی ہے اسکو صاف نظر آتا ہے کہ یہ سب اس کے دشمن ہیں
 انہی نے اس کے پیارے بیٹے کو چھین لیا ہے انھوں نے دانستہ اس پر
 ظلم کیا ہے * * *

علت و معلول اور اسباب و نتائج کا عام طرح پر جو سلسلہ تسلیم کیا جاتا ہے
 شاعر کی قوت تخیل کا سلسلہ اس سے بالکل الگ ہے وہ تمام اشیا کو اپنے نقطہ خیال
 سے دیکھتا ہے اور یہ تمام چیزیں اسکو ایک اور سلسلہ میں مربوط نظر آتی ہیں۔ ہر
 چیز کی غرض غایت اسباب و حرکات نتائج اس کے نزدیک وہ نہیں جو عام لوگ
 سمجھتے ہیں مثلاً * * *

وضع زمانہ قابل دیدن دوبارہ نیست زمانہ کی وضع دوبارہ دیکنے کے قابل نہیں
 روپ نہ کروہ کلازیں خاکداں گذشت اس ٹپ جو یہاں سے جاتا ہے پھر واپس نہیں آتا
 یہ سب جانتے ہیں کہ کوئی مکر زندہ نہیں ہوتا۔ شاعر کے نزدیک اس کی
 وجہ یہ ہے کہ دنیا کے مکر و ہات اس قابل نہیں کہ کوئی شخص اس کو ایک دفعہ

دیکھ کر دوبارہ دیکھنا چاہیے اس لئے جو شخص دنیا سے جاتا ہے پھر واپس نہیں آتا۔
 قوت تخیل ایک چیز کو سو سو دفعہ دیکھتی ہے اور ہر دفعہ اس کو اس میں ایک
 نیا کرشمہ نظر آتا ہے پھول کو تم نے سیکڑوں بار دیکھا ہوگا اور ہر دفعہ تم نے صرف
 اس کی رنگ و بو سے لطف اٹھایا ہوگا۔ لیکن شاعرت قوت تخیل کے ذریعہ سے
 ہر بار نئے نئے پہلو سے دیکھتا ہے اور ہر دفعہ اس کو نیا عالم نظر آتا ہے۔
 اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ تخیل کے لئے معلومات و مشاہدات کی ضرورت
 نہیں یا ہے تو بہت کم کیونکہ تخیل کا عمل واقعی موجودات پر موقوف نہیں وہ
 خیالی باتوں سے ہر قسم کا کام لے سکتی ہے۔ اسکی عمارت کے لئے محالات کا مصداق
 اس طرح کام آسکتا ہے جس طرح ممکنات کا۔ وہ ایک چھوٹی
 سی چیز سے سیکڑوں ہزاروں خیال پیدا کر سکتی ہے چنانچہ ان شعرا نے جنہوں نے
 واقعات یا مشاہدات کو ہاتھ نہیں لگایا خیالات کو گونا گوں عالم پیدا کر دیا جلال
 اسیر زلالی شوکت بخاری بیدل ناصری وغیرہ نے صرف گل و بلبل سے
 دیوان تیار کر دئے اور شاعری کو پستان خیال بنا دیا ۔ ہم کو اس سے
 انکار نہیں کہ ایک معمولی سے معمولی چیز پر قوت تخیل مدتوں صرف کی جاسکتی
 ہے اور سیکڑوں مضامین پیدا کئے جاسکتے ہیں جس کی محسوس مثال متاخرین
 کی نکتہ آفرینیاں ہیں لیکن اسکی مثال مرکب کے گھوڑے کی ہے جو ایک
 خیمہ کے اندر طرح طرح کے تماشے دکھا سکتا ہے لیکن طے منازل

میں میدان جنگ میں گھوڑو ڈر میں کام نہیں آ سکتا۔ اسی طرح تخیل کا عمل بھی ایک محدود دائرہ میں جاری رہ سکتا ہے لیکن اس کی وسعت کیا ہوگی؟ اور ایسی شاعری کس کام آئیگی؟ وہ شاعری جو ہر قسم کے جذبات کا آئینہ بن سکتی ہو جو فطرت انسانی کا راز کھول سکتی ہو جو تاریخی واقعات کو دلچسپی کے منظر پر لا سکتی ہو جو فلسفہ اخلاق کے وقائع بتا سکتی ہو اس کے لئے ایسا محدود تخیل کیا کام آ سکتا ہے۔ تخیل جس قدر قوی با یک متنوع اور کثیر العمل ہوگی اُسی قدر اس کے لئے مشاہدات کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ جس قدر بلند پرواز طائر ہوگا اُسی قدر اس کے لئے فضا کی وسعت زیادہ درکار ہوگی۔ فردوسی نے شاہنامہ لکھا تو سیکڑوں ہزاروں مختلف واقعات لکھنے پڑے اس لئے قوت تخیل کو پورا موقع ملایا ہی سبب ہے کہ شاہنامہ میں شاعری کے تمام انواع موجود ہیں مثلاً شاعری کا ایک بڑا میدان جذبات انسانی کا اظہار ہے جذبات کے بہت سے انواع ہیں مثلاً محبت و عداوت و غم و غضب و حیرت و تعجب و رنج و غم پھر ان میں سے ایک ایک کے مختلف انواع ہیں مثلاً باپ بیٹے کی محبت بھائی بھائی کی محبت ماں بیٹے کی محبت زوجہ شوہر کی محبت اہل وطن کی محبت فردوسی کو یہ تمام مواقع ہاتھ آئے اور موقع پر وہ تخیل سے کام لے سکا چنانچہ اس نے جس جذبہ کا جہاں پر اظہار کیا ہے تخیل کے عمل سے موثر اور جاں گماز کر دیا ہے۔

تخیل کے بے اعتدالی | شعر کی اس سے زیادہ کوئی قدسی نہیں کہ تخیل کا بے جا استعمال کیا جائے۔ طبعیات کے متعلق جسطرح یونانی حکماء کی قوتیں بکار گئیں اور آج تک ان کے پیروہیوں اور صوفیوں کی فضول بحثوں میں الجھ کر کائنات کا ایک عقدہ بھی حل نہ کر سکے بعینہ ہمارے متاخرین شعراء کا یہی حال ہوا ان کی قوت تخیل قدما سے زیادہ ہے لیکن افسوس بالکل رایگان صرف کیگئی ایک شاعرانہ گوشتہارا آشیان مرغ آتش خوار کرد برق عالم سوز یعنی شعلہ غوغائے من اس شعر کے سمجھنے کے لئے امور ذیل کو پہلے ذہن نشین کر لینا چاہئے۔

(۱) مرغ آتش خوار ایک پرند ہے جو آگ کھاتا ہے (۲) آہ اور فریاد میں چونکہ گرمی ہوتی ہے اس لئے آہ فریاد کا شعلہ سے تشبیہ دیتے ہیں (۳) مرغ آتش خوار وہاں رہتا ہے جہاں آگ ہوتی ہے شاعر کہتا ہے کہ میری فریاد میں اس قدر گرمی ہے کہ کانوں میں پہنچی تو وہاں آگ پیدا ہو گئی اس بنا پر مرغ آتش خوار نے لوگوں کے کانوں میں جا کر گھونسلے بنائے ہیں کہ یہاں آگ نصیب ہوگی۔

متاخرین کی اکثر نکتہ آفرینیاں اسی قسم کی ہیں جسکی وجہ یہی ہے کہ قوت

تخیل کا استعمال بے جا طور سے ہوا ہے + + +

تشبیہ و استعارہ | یہ چیزیں شاعری بلکہ عام زبان آدمی کے خط و خال میں جن کے بغیر انشا پر داندی کا بحال قائم نہیں رہ سکتا ایک عامی ہیں علمی بھی جب

جوش و غیظ و غضب میں لبریز ہو جاتا ہے تو جو کچھ اسکی زبان سے نکلتا ہے استعارات کا قالب بدل کر نکلتا ہے۔ غم و رنج کی حالت میں انشا پر دازی اور تکلف کا کسکو خیال ہو سکتا ہے لیکن اس حالت میں بھی بے اختیار استعارات زبان سے ادا ہوتے ہیں مثلاً کسی کا عزیز مر جاتا ہے تو کہتا ہے ”سینہ پھٹ گیا“ ”دل میں چھید پڑ گئے“ ”آسمان ٹوٹ پڑا“ ”تجھ کو کسی نظر کھا گئی“۔ یہ سب استعارے ہیں اس سے ظاہر ہو گا کہ استعارہ دراصل فطری طرز ادب ہے۔ لوگوں نے بے اعتدالی سے تکلف کی حد تک پہنچا دیا + + +

تشبیہ کی تعریف اگر ہم یہ کہنا چاہیں کہ فلاں شخص نہایت شجاع و بہادر ہے تو اگر انھیں لفظوں میں اس مضمون کو ادا کریں تو یہ معمولی طریقہ ادا ہے۔ اسی بات کو اگر یوں کہیں کہ ”وہ شخص شیر کے مثل ہے“ تو یہ تشبیہ ہوگی اور معمولی طریقہ کے بہ نسبت کلام میں کچھ زیادہ زور پیدا ہو جائے گا اگر یوں کہیں کہ ”وہ شخص شیر ہے“ تو زور اور بڑھ جائیگا لیکن اگر اس شخص کا مطلق خیال نہ کیا جائے اور یوں کہا جائے کہ میں نے ایک شیر دیکھا اور اس سے مراد وہی شخص ہو تو استعارہ ہے اسی مطلب کے ادا کرنے کا ایک اور طریقہ ہے کہ شیر کا نام بھی نہ لیا جائے بلکہ شیر کے جو فضائل ہیں اس شخص کی نسبت استعمال کئے جائے کہ وہ جب میدان جنگ میں ڈکارتا ہوا نکلا تو ہل چل پر غمی زدگانا خاصہ شیر کی آواز کو کہتے ہیں ایہ بھی استعارہ ہے اور پہلے طریقہ کے نسبت زیادہ لطیف ہے۔

جَدّت و لُطْف ادا | شاعری کے لئے یہ سب سے مقدم چیز ہے بلکہ بعض اہل فن کے نزدیک جَدّت ادا ہی کا نام شاعری ہے ایک بات یہ بھی طرح سے کہی جائے تو ایک معمولی بات ہے۔ اسی کو اگر جدید انداز اور نئے اسلوب سے ادا کر دیا جائے تو یہ شاعری ہے۔

ایک دفعہ حجاج نے ایک بدو سے پوچھا تم سے کوئی راز کی بات کہی جائے تو تم اس کو چھپا سکتے ہو اس نے کہا کہ ”میرا سینہ راز کا مدفن ہے“ یعنی رازِ سینہ میں مگر رہ جاتا ہے۔ سینہ سے نکل کیونکر سکتا ہے اس بات کو اگر وہ یوں ادا کرنا کہ ”میں راز کو کسی حالت میں کبھی ظاہر نہیں کرتا“ تو معمولی بات ہوتی لیکن طرزِ ادا کے بدل دینے نے ایک خاص لُطف پیدا کر دیا اور اب وہی بات شعر بن گئی شاعری انشا پر دازِ بلاغت ان تمام چیزوں کی جادوگری اسی جَدّت ادا پر موقوف ہے + + +

حسن الفاظ | اہل فن کے دو گروہ بن گئے ہیں ایک لفظ کو ترجیح دیتا ہے اور اسکی تمام تر کوشش الفاظ کی حُسن و خوبی پر مبذول ہوتی ہے۔ عرب کا اصلی انداز یہی ہے۔ بعض لوگ مضمون کو ترجیح دیتے ہیں اور الفاظ کی پروا نہیں کرتے یہ ابن الرومی اور ربیع کا مسلک ہے۔

”لیکن زیادہ تر اہل فن کا یہی مذہب ہے کہ لفظ کو مضمون پر ترجیح ہے وہ کہتے ہیں کہ مضمون تو مہذب پیدا کر سکتے ہیں لیکن شاعری کا معیار

کمال یہی ہے کہ مضمون اداکن الفاظ میں کیا گیا ہے؟ اور بندش کیسی ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ شاعری یا انشا پر داری کا مدار زیادہ تر الفاظ ہی پر
ہے۔ گلستاں میں جو مضامین اور خیالات ہیں ایسے اچوتے اور نادر نہیں
لیکن الفاظ کی فصاحت اور ترتیب اور تناسب نے ان میں سحر پیدا کر دیا
ہے انھیں مضامین اور خیالات کو معمولی الفاظ میں ادا کیا جائے تو سارا اثر
جاتا رہے گا۔ ظہوری کا ساقی نامہ نازک خیال موشگافی اور مضمون بندی
کا طلسم ہے لیکن سکندر نامہ کا ایک شعر پورے ساقی نامہ پر بھاری ہے سکی
وجہ یہی ہے کہ ساقی نامہ میں الفاظ کی وہ متانت اور شان و شوکت اور بندش
کی وہ کپنگی نہیں جو سکندر نامہ کا عام جوہر ہے۔ حافظ کا شعر ہے۔

آغتم این جام جہاں میں بہ تو کو دلو حکیم گفت آں روز کہ اس گنبد مینامی کرد
جو خیال اس شعر میں ادا کیا گیا ہے اسکو الفاظ بدل کر ادا کر دو شعر

خاک میں مل جائیگا۔ ذیل کے دونوں مصرعوں میں۔

ع تھا لبیل خوشگو کہ چمکتا ہے چمن میں

ع لبیل چمک رہا ہے ریاضِ ربول میں

مضمون بلکہ بعض الفاظ تک مشترک ہیں پھر بھی زمین آسمان کا فرق ہے

اس تقریر کا یہ مطلب نہیں کہ شاعر کو صرف الفاظ سے غرض رکھنی

چاہئے اور معنی سے بالکل بے پروا ہو جانا چاہئے بلکہ مقصد یہ ہے کہ

مضمون کتنا ہی بلند اور نازک ہو لیکن اگر الفاظ مناسب نہیں ہیں تو شعر میں کچھ تاثر نہ پیدا ہو سکے گی اس لئے شاعر کو یہ سوچ لینا چاہئے کہ جو مضمون اسکے خیال میں آیا ہے اُسی درجہ کے الفاظ اس کو میسر آسکیں گے یا نہیں؟ اگر نہ آسکیں تو اس کو بلند مضامین چھوڑ کر اُنھیں سادہ اور معمولی مضامین پر قناعت کرنی چاہئے جو اس کے بس کے ہیں اور جنکو وہ عمدہ پیرایہ اور عمدہ الفاظ میں ادا کر سکتا ہے کسی نے نہایت حق کہا ہے۔

برائے پاکی لفظے شبے بروز آرد کہ مرغ و ماہی باشند خفته او بیدار
یعنی شاعر ایک ایک لفظ کی تلاش میں رات رات بھر جاگتا رہ جاتا ہے جب کہ مرغ اور چھلیاں تک سوتی ہیں، یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک عمدہ سے عمدہ خیال عمدہ سے عمدہ مضمون عمدہ سے عمدہ نظم اس وجہ سے برباد ہو جا کہ اس میں صرف ایک لفظ اپنے درجہ سے گر گیا۔

مبالغہ جن لوگوں نے کذب اور مبالغہ کو شعر کا زیور قرار دیا ہے انکی غلطی کی وجہ یہ ہوئی کہ کذب و مبالغہ میں تخیل کا استعمال کرنا پڑتا ہے مثلاً اگر گھوڑے کی نسبت یہ کہا جائے کہ وہ ایک منٹ میں ایک کروڑ کوں طے کر لیتا ہے تو شعر بالکل بے مزہ اور مہمل ہوگا۔ اس لئے جب کوئی شاعر اس قسم کا مبالغہ کرنا چاہے گا تو ضرور ہے کہ تخیل سے کام لے مثلاً ایک شاعر کہتا ہے۔

رو برو سے اگر آئینہ کے اس گلگوں کو پھینک دے اس کے بھی شرق و غرب تک اتنے عرصہ میں پھر آئے تو اسے باور نہ کرے عکس بھی آئینہ سے ہونے نہ پامنگ اس سے ظاہر ہو گا کہ مبالغہ میں کوئی حُسن پیدا ہوتا ہے تو تحنیل کی بنا پر ہوتا ہے نہ اس لئے کہ وہ جو مٹ اور مبالغہ ہے۔

شاعری سے اگر صرف تفریح خاطر مقصود ہو تو مبالغہ کام آ سکتا ہے لیکن وہ شاعری جو ایک طاقت ہے جو قوموں کو زیر و زبر کر سکتی ہے جو ملک میں ہل چل ڈال سکتی ہے جس سے عرب قبائل میں آگ لگا دیتے تھے۔ جس سے توجہ کے وقت درو دیوار سے آنسو نکل پڑتے تھے۔ وہ واقفیت اور اصلیت سے خالی ہو تو کچھ کام نہیں کر سکتی تم نے تاریخ میں پڑھا ہو گا کہ جاہلیت میں ایک شعر ایک معمولی آدمی کو تمام عرب میں روشناس کر دیتا تھا بخلاف اس کے ایران کے شعرا نے جن معدوحوں کی تعریف میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دئے ان کا نام بھی کوئی نہیں جانتا اسکی یہی وجہ ہے کہ شعراے جاہلیت کے کلام میں واقفیت ہوتی تھی اس لئے ان کا واقعی اثر ہوتا تھا ایرانی شعرا تو ان کے طوطے مینا بناتے تھے جس سے دم بھر کی تفریح ہو سکتی تھی باقی بیچ۔

شعریوں اثر کرتا ہے | اس مضمون کے دل نشیں ہونے سے پہلے یہ نکتہ سمجھنا چاہئے کہ انسانی معاشرت کی کل فلسفہ اور سائنس سے نہیں بلکہ جذبات

چل رہی ہے فرض کرو ایک بڑے شخص کا بیٹا مر گیا ہے اور لاش سامنے پڑی ہے یہ شخص اگر سائنس سے راسخ ہے تو یہ جواب ملے گا کہ ایسے اسباب جمع ہو گئے جن کی وجہ سے دوران خون یا دل کی حرکت بند ہو گئی اسی کا دوسرا نام مرنا ہے یہ ایک مکانات کا واقعہ ہے جو ناگزیر وقوع میں آیا اور چونکہ دوبارہ زندہ ہونے کی کوئی تدبیر نہیں اسی لئے روناد ہونا بیکار بلکہ ایک حماقت کا کام ہے لیکن کیا تمام عالم میں ایک شخص کا بھی اس پر عمل ہے؟ کیا خود سائنس داں اس اصول سے کام لے سکتا ہے؟ بچوں کا پیار ماں کی مامتا محبت کا جوش غم کا ہنگامہ موت کا رنج ولادت کی خوشی کیا ان چیزوں کو سائنس سے کوئی تعلق ہے؟ لیکن اگر یہ چیزیں مٹ جائیں تو دفعتاً شام اچھا جائیگا اور دنیا قالب بے جان شراب بے کیفیت گل بے رنگ گوہر بے آب ہو کر رہ جائے گی۔ دُنیا کی چیل پہل رنگینی دلا دینے کی لہجہ سائنس کی وجہ سے نہیں بلکہ انسانی جذبات کی وجہ سے ہے جو عقل کی حکمت سے قریباً آزاد ہے۔

شاعری کو جذبات ہی سے تعلق ہے اس لئے تاثیر اس کا عنصر ہے شاعری ہر قسم کے جذبات کو براہِ نگینہ کرتی ہے اس لئے رنج خوشی جوش استعجاب حیرت میں جو اثر ہے شعر میں بھی وہی اثر ہوتا ہے معنوی شاعری اس لئے دل پر اثر کرتی ہے کہ جو مناظر اثر انگیز ہیں شاعری انکو

پیش نظر کر دیتی ہے۔ بادِ سحر کے جھونکے آبِ رواں کی رفتار بچھوٹوں کی شگفتگی
 غنچوں کا تبسم ہنرہ کی لہلہا ہٹ خوشبوؤں کی لپٹ۔ بادل کی بچھاؤ بجلی کی چمک۔
 یہ منظر آنکھ کے سامنے ہو تو دل پر وجد کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ شاعری
 ان مناظر کو بعینہ پیش کر دیتی ہے اس لئے اس کی تاثیر سے کیونکر انکار ہو سکتا
 شاعری صرف محسوسات کی تصویر نہیں کھینچتی بلکہ جذبات اور احساسات
 کو بھی پیش نظر کر دیتی ہے اکثر ہم خود اپنے نازک اور پوشیدہ جذبات سے
 واقف نہیں ہوتے یا ہوتے ہیں تو ایک دھندلا دھندلا نقش نظر آتا ہے۔
 شاعری ان پس پردہ چیزوں کو پیش نظر کر دیتی ہے۔ دھندلی چیزیں چمک
 اٹھتی ہیں بیٹا جو نقش آ جا کر ہو جاتا ہے کھوٹی ہوئی چیز ہاتھ آ جاتی ہے۔
 خود ہماری روحانی تصویر جو کسی آئینہ کے ذریعہ سے ہم نہیں دیکھ سکتے شعر
 ہم کو دکھاتا ہے۔

دُنیا کا کاروبار جس طرح چل رہا ہے اسکا اصلی فلسفہ خود غرضی اور
 اصول معاوضہ ہے اور جب اس کو زیادہ وسعت دیجائے تو ہمارے اعمال
 اور افعال ایک سلسلہ داد و ستد بن جاتے ہیں۔ بچوں کی ہمت اور پردخت اس لئے
 ہے کہ وہ آئندہ چل کر ہمارے کام آئیں گے باپ کی اطاعت اس کے
 پچھلے احسانات کا معاوضہ ہے۔ مہمان نوازی اس اصول پر ہے کہ ہم کو
 بھی کبھی مہمان ہونے کی ضرورت پیش آئیگی قومی کام اس لئے کئے جاتے

ہیں کہ واسطہ در واسطہ خود کرنے والے کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔
 اس فلسفے سے بے شبہ عمل کی قوت بڑھ جاتی ہے تجارت کو ترقی ہوتی
 ہے کار و بار وسیع ہو جاتے ہیں۔ دولت کی بہتات ہو جاتی ہے لیکن تمام
 جذبات مرجاتے ہیں دل مردہ ہو جاتا ہے لطیف اور نازک احساسات
 فنا ہو جاتے ہیں عشق و محبت برباد ہو جاتے ہیں اور تمام دُنیا ایک
 بے حس کل بن جاتی ہے جو خود غرضی کی قوت سے چل رہی ہے اس حالت
 میں شعر شریفانہ جذبات کو تروتازہ کرتا ہے وہ محسوسات کے دائرہ سے
 نکال کر ہم کو ایک اور وسیع اور دلفریب عالم میں لے جاتا ہے وہ ہم کو
 بے غرض اور بے لاگ دوستی کی تعلیم کرتا ہے وہ ہم کو سچی خوشی اور سچی مسرت
 دلاتا ہے جب کہ کار و بار کے ہجوم مقابلہ کی کشمکش معاملات کی الجھن ترددات
 کی وار و گیر سے دل بالکل ہٹ ہار دیتا ہے تو شعر مجسم سکون اور اطمینان
 بن کر ہمارے سامنے آتا ہے اور کہتا ہے۔

شراب تلخ وہ ساقی کہ مرد افکن بود زورش
 کہ تانختہ بیا سایم زد دنیا و شر ز شورش

جب کہ سائنس اور مشاہدات کی مارست ہم کو سخت دل اور کٹر بنا
 دیتی ہے اور تمام مقصدات اور مسلمات عامہ کی دل میں حقارت پیدا
 ہو جاتی ہے کیسی بات پر اعتبار نہیں آتا کسی چیز کا اثر نہیں رہتا مادہ کے

سوا تمام چیزوں کی حکومت دل سے اُٹھ جاتی ہے اسوقت شاعری
 ہمارے دل کو رقیق اور نرم کرتی ہے جس سے تسلیم اثر پذیری اور اعتقاد
 پیدا ہوتا ہے مادیت کے بجائے روحانیت قائم ہوتی ہے وہ ہم کو عالم غیب
 میں لے جاتی ہے جہاں تھوڑی دیر کے لئے مشاہدات کی بے رحم حکومت
 سے ہم کو نجات مل جاتی ہے۔

جب کہ دولت اور امارت کی سحر کاریاں ہمارے دل کو رشک و حسرت
 سے بھر دیتی ہیں۔ سلاطین اور امراء کی نظر فرور زندگی ہمارے دل پر رشک
 کے چر کے لگاتی ہے اسوقت ہاتھ غیب کی یہ آواز آتی ہے۔

بس کن ز کبر و ناز کہ دیدہ ست روزگار
 چینِ قباے قیصر و طرفِ کلاہ کے



پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی

پیدائش فیض آباد ۱۸۸۲ء

بزرگوں کا وطن لکھنؤ ہے آپ ۱۸۸۲ء بمقام فیض آباد پیدا ہوئے
 لیکن چند ہی سال بعد لکھنؤ چلے آئے اور وہیں آپ نے تعلیم پائی -
 کیننگ کالج لکھنؤ سے - بی - اے - کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد قانون کا
 امتحان دیا اور اب لکھنؤ میں وکالت کرتے ہیں شاعری کا شوق مغربی
 سے ہے شاید پہلی غزل نو برس کی عمر میں کہی تھی اس زمانہ سے آپ برابر
 شعر کہتے ہیں مگر شعر کہنے سے زیادہ آپ کو اساتذہ کا کلام پڑھنے کا شوق
 ہے - غالب - آتش اور انیس کے کلام کے پنڈت صاحب موصوف شیدا
 ہیں اور آپ کی غزل پر آتش اور مسدس پر انیس کی تقلید کا اثر نمایاں
 ہے - خیالات ضرور مختلف ہیں مگر سلاست زبان بندش الفاظ اور حسن ترکیب
 میں انھیں استادوں کی پیروی ہے - آپ کا خیال ہے کہ محض نئے خیالات
 کا نظم کر دینا شاعری نہیں ہے آپ کی یہ کوشش ہے کہ نئے خیالات ضرور

۱۵ چکبست عن ہے تخلص نہیں ہے -

نظم کئے جائیں مگر زبان اور اسلوب بیان سے لطافت اور پاکیزگی کا جو ہر نہ جاتا رہے کیونکہ زبان میں الفاظ کی بندش سے صنائی کرنا تصنع نہیں (شاعری کا جزو اعظم ہے اس خیال کا اثر آپ کی غزلوں میں بھی موجود ہے۔

پنڈت برج زاین صاحب کو نثر لکھنے کا بھی شوق ہے آپ کے مضامین جو کشمیر درپن زمانہ اور ادیب میں شائع ہوئے ہیں زیادہ تر ادبی تنقید سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً دیا خٹک کریم۔ رتن ناتھ سرشار داغ۔ ایک یادگار مشاعرہ وغیرہ۔ ادبی تنقید اردو داں حضرات کے لئے ایک بالکل نئی چیز ہے یہاں دلی اور لکھنؤ کی رقابت اور آتش و ناسخ اور انیس و دہر کی معرکہ آرائیوں کا بازار کرم تھا مگر اصلی تنقید کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پنڈت برج زاین صاحب چلبست نے تنقید کا نہایت صحیح اور اعلیٰ معیار مد نظر رکھا ہے اور آپ کے مضامین زبان کی مناسبت اور شگفتگی کے لحاظ سے اردو نثر کے نہایت عمدہ نمونے ہیں۔



تاریخ

ماخوذ از رسالہ تہذیب

تاریخ ہے مسلم و باہوش باخبر ہو اس کے مدرسہ میں اگر ایک دم گزر
مضمون ملیں وہ جس ہوروشن لبش عالم جہاں کا اور ہی آنے لگے نظر
اُٹھے نقاب دیدہ و ہم و خیال سے
ماضی زیادہ صاف نظر آئے حال سے

تاریخ عقدہ ہمارے سلف کی کلید ہے رشتہ یہی میان قریب و بعید ہے
جس کو کہ ہم سمجھتے ہیں وضع جدید ہے اس کی لباس گمنام سے قطع و برید ہے
تاریخ حال اہل سلف کی گواہ ہے
غافل کے واسطے سبق انتباہ ہے

(پینڈٹ بشن زائن در۔ آبر)

موجودہ تہذیب کا یہ ایک علمی اصول ہے کہ دُنیا میں جس قدر رسم و رواج یا
علوم و فنون ہیں وہ ایک سلسلہ وار ترقی سے ظہور میں آئے ہیں فن تاریخ بھی اہل
سے مستثنیٰ نہیں ہے ابتدائے آفرینش سے موجودہ زمانہ تک یہ فن مختلف تہذیبوں
کے مختلف ساچنوں میں ڈھلتا چلا آیا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جب انسان
کو دُنیا میں آئے ہوئے بہت کم دن گزرے تھے قدرت کے کارخانے

اس کے لئے معنی سے کم نہ تھے اس عالم حیرت میں اس کے نگاہوں کے سامنے جو حیرت انگیز نقشے گزرتے تھے وہ اس کے دل پر عجب اثر پیدا کرتے تھے۔ مثلاً وہ دیکھتا تھا کبھی دن بڑے ہوتے ہیں کبھی راتیں کبھی چاند سورج سیاہی میں چھپ جاتے ہیں۔ کبھی مرمی زور شور کے ساتھ اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ کبھی گرمی کے موسم کی تپش حد سے زیادہ ترقی کر جاتی ہے۔ شروع شروع میں وہ قدرت کے کارخانوں میں کوئی انتظام یا ترتیب نہیں پاتا تھا ان انقلابات سے متاثر ہو کر وہ دنیا کی کیفیت تشبیہوں اور استعاروں کے رنگ میں ایک شاعرانہ طرز پر بیان کرتا تھا۔ اب بھی جو وحشی قومیں باقی ہیں ان کی گفتگو تشبیہ اور استعارے کے پیرائے میں ہوا کرتی ہے۔ مثلاً اگر کسی وحشی کو یہ کہنا ہو گا کہ فلاں شخص میرا ہمسایہ ہے تو وہ یہ کہے گا کہ اس کے گھر کی پتیاں میرے گھر میں اڑ کر آتی ہیں چنانچہ زمانہ گذشتہ میں بھی وحشی قوموں کا یہی رنگ تھا اس قسم کے گیت یا نہیں ہر ملک اور ہر قوم کی تاریخ میں موجود ہیں جن میں وہ خیالات پائے جاتے ہیں جو کہ انسان کے دل میں ابتدائی تہذیب میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ مثلاً سیاروں کو ایک قسم کا دیوتا ماننا ہے۔ دریاؤں اور پہاڑوں کی عظمت و شوکت سے متاثر ہو کر ان کی پرستش کرتا ہے اور جب اس کے جذبات دلی جوش میں آتے ہیں تو وہ ان خیالات کو شاعرانہ طرز پر ادا کرتا ہے

جو کہ نظموں یا گیتوں کی شکل میں یاد رہ جاتے ہیں اور آئندہ نسلوں کو ایک ایسی تاریخ کا کام دیتے ہیں جس سے اس وقت کی تہذیب و ترقی کی حالت آئینہ وار نظر آتی ہے۔ ایسی نظموں وغیرہ کو جن کو انگریزی زبان میں مائی تھالوجی کہتے ہیں خلافت عقل انسانی جان کر بالکل بے وقعت نہیں سمجھنا چاہئے ان سے کامل طور پر تاریخی واقعات کی تشریح نہیں ہوتی ہے لیکن اس وقت کی تہذیب کا بحیثیت مجموعی اندازہ ہو سکتا ہے جس وقت کہ نظمیں تصنیف ہوئی تھیں اور یہ ایسی تحقیقات ہے جو کہ تاریخی تحقیقات کی مدد سے کسی حالت میں باہر نہیں ہے اس موقع پر یہ کہنا ضروری ہے کہ تاریخی مراحت و قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو خارجی واقعات کی تشریح ہے جو کہ موجودہ سائنس کے اصولوں پر مبنی ہے۔ دوسرے جذبات انسانی کی توسیع و ترقی کی تشریح ہے فن تاریخ کے ابتدائی کارناموں سے ہم خارجی واقعات کی تشریح عمل میں نہیں لاسکتے لیکن اس وقت کے انسانوں کے جذبات دلی اور عقائد کا رجحان نہایت آسانی سے دریافت کر سکتے ہیں اور اس قسم کے تاریخی کارنامے ایک نہایت اعلیٰ علمی ذخیرہ کا کام دے سکتے ہیں یہ فن تاریخ کی ابتدائی منزل ہے۔

دوسری منزل میں اس دلچسپ فن نے ایک نئی صورت پکڑی جب کہ انسان ترقی کے میدان میں دس قدم اور آگے بڑھا۔ اس کا تجربہ وسیع ہوتا گیا۔ دل و دماغ کی پنہاں قابلیتیں ظہور میں آئیں اس حالت میں

تاریخ صرف اُن جذبات و عقائد انسانی کی داستان نہ رہی جو کہ انسان کے دل میں محض قدرت کے عظیم الشان کارخانے دیکھنے سے پیدا ہوئے تھے بلکہ اس میں خارجی واقعات کو مثلاً انسانی کارناموں کو بھی دخل ہوتا گیا لیکن یہ واقعات اصلی حالت میں نہیں بیان کئے گئے ہر روایت کے بیان میں خیالی غلط و شوکت کو بہت کچھ دخل رہا۔ جو عظیم الشان انسان اس دور میں پیدا ہوئے ان کی تعریف میں بہت سی داستانیں کہی گئیں کچھ نظم میں کچھ نثر میں مگر واقعات کی مراحت کا خیال بالکل بالائے طاق رہا۔ اس قسم کی داستانیں پڑھنے سے ہم کو ہزاروں تاریخی واقعات معلوم ہوتے ہیں مگر جیسا کہ پیشتر لکھا گیا ہے ہر واقعہ کے بیان میں مبالغہ کو بہت دخل ہے۔ مثلاً لڑائیوں کی داستانیں اس طرح لکھی گئیں ہیں جنہیں عقل انسانی کبھی قابل اعتبار نہیں مان سکتی یا اکثر عظیم الشان انسانوں کی تعریف میں مبالغہ اور جڑا اعتدال سے گزر گیا ہے۔ یورپ میں آرتھر ہرکولیز وغیرہ ایسے قدیمی تہذیب کے عظیم الشان انسانوں کی مثالیں موجود ہیں جن کی بہادری اور روئیں تنی کی تعریف میں دریا بہاؤ نے گئے ہیں۔ ہندوستان میں مہابھارت کے سوربیران کے جواب میں ان کی بہادری کی روایتیں جس طرز پر لکھی گئی ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ کس قدر مبالغہ آمیز ہیں مہابھارت کے ہر کوئی یعنی بھیم کی نسبت یہ روایت تحریر ہے کہ اس نے غصہ کے عالم میں ایک بہت بڑا درخت زمین سے

اُکھڑ کر اپنے مخالف کی طرف اس طرح کھینچ مارا جس طرح کوئی تنکا اٹھا کر پھینک دے
 گوبادی النظر میں یہ واقعہ خلاف قانون قدرت معلوم ہو لیکن اصل میں یہ
 ایک بہادر اور قومی ہیگل شخص کی بہادری اور روئیں تنی کی مبالغہ آمیز تعریف
 ہے اس اصول کو پیش نظر رکھ کر ہم اگر اس قسم کی حکایتوں کا مطالعہ کریں تو
 ہم بہت کچھ تاریخی واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے
 کہ مبالغہ پندی کی وجہ کیا ہے حقیقت حال یہ ہے کہ دنیا میں بڑے بڑے
 لوگوں کی نسبت مبالغہ آمیز روایتیں مشہور ہو جاتی ہیں اور جس قدر زمانہ گزرتا
 جاتا ہے اس ذخیرہ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جن خلاف قدرت کرشموں
 کا اُنھوں نے اپنی زندگی میں کبھی دعویٰ نہیں کیا اُنھیں کا وہ مجموعہ بتلا
 جاتے ہیں مثلاً ہندوستان میں گوتم بدھ نے کبھی اوتار ہونے کا دعویٰ
 نہیں کیا بُت پرستی کے خلاف اس نے وعظ کہا لیکن برہمنوں نے ایک
 پیران بنا کر اس کو اوتار کا اعزاز بخشا ہے اور اس کے مریدوں نے اس کے
 مرنے کے بعد اس کا بُت پوجنا شروع کر دیا ہے۔ ع
 بہ میں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

یا شیواجی کی مثال بہت نزدیک زمانہ کی مثال ہے یہ سب
 جانتے ہیں کہ شیواجی انسان تھا اس کے وقت کی قابل اعتبار تاریخ
 موجود ہے لیکن مہاراشٹ میں ایک فرقے کا یہ عقیدہ ہے کہ شیواجی شیو کا

اوتا رہتا اور اس کی پیدائش ایک معجزہ کے ذریعہ سے طور میں آئی تھی ان واقعات پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان میں چونکہ غفلت و شوکت کی قدر کرنے کے جذبات قدرتی طور پر موجود ہیں اس وجہ سے مبالغہ آمیز روایتیں بڑے بڑے آدمیوں کی نسبت مشہور ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اکثر ان کی پرستش ہونے لگتی ہے۔ ابتدا سے تہذیب میں چونکہ یہ جذبات نہایت زور شور کے ساتھ انسان کے دل میں پائے جاتے تھے اور اس عقیدہ غائبانہ روحانی قوتوں میں تھا۔ لہذا اس زمانہ میں جو عظیم الشان انسان گزرے اُن کے مداحوں نے اُن کو آسمان پر چڑھا دیا اور اُن کی تعریف میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ مبالغہ پسندی کو عیب نہیں سمجھتے تھے اُن کے نزدیک یہ ایک قسم کی عزت تھی کہ بڑے آدمیوں کی صفت میں مبالغہ سے کام لیا جاوے نیز وہ یہ سمجھتے تھے کہ بزرگوں کے کارناموں پر جس قدر خیالی تعریف کی وارش کی جائے زیبا ہے۔ لہذا جب ہم اس قسم کی روایتیں پڑھیں تو ہم کو اس امر کا خیال لازمی ہے کہ ہم اصلی واقعات بجنسہ نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ ان واقعات کی وہ تصویر دیکھ رہے ہیں جس میں کہ بہت کچھ مبالغہ کارنگ بھرا ہوا ہے یہ فن تاریخ کی دوسری منزل کی حالت ہے۔ تیسری منزل کی سیر کا راستہ بہت کچھ صاف ہے یہ وہ زمانہ ہے

جبکہ انسان کو تاریخ کی غرض سے تاریخ لکھنے کی حس پیدا ہوئی ابھی تک اس کا منشا محض جذبات دلی کا اظہار تھا یا بزرگوں کی عظمت کرنا نہ کہ تاریخ کی غرض سے تاریخ لکھنا۔ اب وہ زمانہ آیا کہ جب اُس نے گزشتہ موجودہ واقعات کو یکجا جمع کرنا شروع کیا لیکن یاد رہے کہ اس وقت تک تاریخ نویسی کا مذاق تکمیل پر نہیں پہنچ گیا تھا۔ اُس زمانہ کی تاریخیں محض واقعات کی فہرستیں ہیں نہ کہ ملک اور سوسائٹی کی حالت فلسفانہ تفسیر نیز اس وقت تک مبالغہ کو تاریخی واقعات لکھنے میں بہت کچھ دخل تھا ہراؤٹس یورپ کا اس رنگ کا پہلا باقاعدہ مورخ ہے اس نے اپنی تاریخ میں اکثر واقعات لکھے ہیں جو مبالغہ سے پر ہیں یا اسی زمانہ کا ایک دوسرا مورخ ہے اُس نے صاف الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ میں نے اصلی واقعات کے علاوہ بہت کچھ اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے جیسے فردوسی نے شاہنامہ میں صاف طور پر لکھ دیا ہے ۱۵

منش کردہ ام رستم پہلواں و گرنہ یلے بود در سیتاں
ہندوستان میں تاریخ نویسی کا مذاق اس حد سے آگے ترقی نہ کر سکا۔ یہاں پر انیس وغیرہ موجود ہیں جن کے پڑھنے سے تہذیب قدیم کا حال معلوم ہو سکتا ہے یا کشمیر کی تاریخ کا پتہ اب چلا ہے لیکن کوئی باقاعدہ تاریخ تمام ملک کی موجود نہیں اس میں شک نہیں کہ ہندوستان

کے قدیم باشندوں نے مختلف علوم و فنون میں حیرت انگیز ترقی کی تھی جسکی ثنا و صفت میں یورپ کے محققین تر زبان ہیں لیکن فن تاریخ نے یہاں نشو و نما نہ پائی اکثر حضرات کا یہ مقولہ ہے کہ مسلمانوں کے دوران حکومت میں اکثر جا پراور متعصب فرما دواؤں نے ہندوستان کی کتب تاریخی جلا دیں مگر یہ خیال بالکل غلط ہے اور اس قابل نہیں کہ اس پر اعتبار کیا جائے کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کی فلسفہ اور شاعری وغیرہ کا ذخیرہ تو اب تک موجود ہے مگر تاریخی کتابیں اس انتظام کے ساتھ جلائی گئیں کہ انکی خاک بھی سرمہ کے لئے نہیں ملتی۔ اصل وجہ یہ ہے کہ فن تاریخ نے اُسی مملک میں زیادہ نشو و نما پائی کہ جس ملک میں نظام معاشرت پولیشکل اصولوں پر مبنی تھا۔ ہندوستان کی حالت جدا گانہ تھی یہاں نظام معاشرت کا دار و مدار محض مذہبی اصولوں پر تھا یہاں دنیا سے زیادہ عقی کی فکر رہتی تھی اس لئے فن تاریخ کو قابل طمینان ترقی نہ ہوئی کیونکہ فن مذکور زیادہ تر دنیاوی کارناموں سے تعلق رکھتا ہے۔ اب فن تاریخ کی چوتھی منزل کا حال ملاحظہ ہو۔ جب انسان میں غور و فکر کی قابلیت نے ترقی کی اور وہ محض علو کا غلام نہیں رہا تو اُس نے واقعات کو صرف سرسری نظر سے دیکھنا ناپسند کیا بلکہ اُن کی رفتار کا بحیثیت مجموعی اندازہ کرنا شروع کیا عام اسباب کے عام نتائج اخذ کئے اور ان عام نتائج کی مدد سے چند عام اصول قائم کئے

اور ان عام اصولوں کو پیش نظر رکھ کر واقعات کی رفتار پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی۔ اس دماغی ترقی کے ساتھ نظام معاشرت کی سادگی میں بھی روز بروز فرق آتا گیا اور زندگی کی داستان پیچیدہ ہوتی گئی۔ اس حالت میں تاریخ جب لکھی گئی تو وہ محض واقعات کی فہرست نہ رہی بلکہ اُن واقعات کے اسباب و نتائج کی فلسفیانہ تشریح ہو گئی اس قسم کی تاریخ نویسی کی بنیاد یورپ میں پڑی۔ اس میں شک نہیں کہ عربی فارسی وغیرہ میں اکثر مستند تاریخیں موجود ہیں مگر ان میں صرف سلطنتوں کے کمال و زوال کی داستانیں درج ہیں مگر سوسائٹی اور مذہب وغیرہ کے پیچیدہ مسائل کا ان میں ذکر نہیں ہے۔ یورپ میں سب سے پیشتر ملک اطالیہ میں گئے دلی نے فلسفیانہ تاریخ کی داغ بیل ڈالی۔ اس کے بعد جرمنی انگلستان وغیرہ میں ایسے مورخ پیدا ہوئے جنہوں نے علاوہ معمولی واقعات کے سوسائٹی کے مختلف پہلوؤں پر تاریخ میں نقادانہ نظر ڈالی۔ آخر کار فرانس میں گنتر و تاریخ تمدن لکھ کر تمام دنیا کو حیرت میں ڈال دیا غرضکہ رفتہ رفتہ فن تاریخ ترقی کرنا گیا اور آخر کار تجربہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ فن تاریخ شاعری اور فلاسفی کا مجموعہ ہے یعنی مورخ کامل دہی شخص ہو سکتا ہے جو کہ فلسفی کا دماغ اور مصور کا قلم رکھتا ہو۔ دماغ سے واقعات کا فلسفیانہ طور پر اندازہ کرے اور جادو کار قلم سے سوسائٹی کے انداز معاشرت کی

تصویر کھینچے لیکن ابھی تک غالباً یورپ میں بھی کوئی ایسا موترخ نہیں پیدا ہوا جس میں یہ دونوں وصف درجہ کمال پر پائے جاتے ہوں بالفصل وہاں فنِ تاریخ دو حصوں میں منقسم ہے ایک فرقہ ایسے مورخین کا ہے جس نے واقعات کی تشریح اور ان کی فلسفیانہ تحقیقات اپنا اپنا حصہ کر لیا ہے۔ دوسرا فرقہ تاریخی فسانہ نگاروں کا ہے۔ اس قسم کے مصنفین زمانہ ہلے دور و راز کی سوسائٹی کے طرز معاشرت کی تصویر افسانوں کے پیرایہ میں کھینچتے ہیں جو شخص کہ پوری طور سے تاریخی واقفیت حاصل کرنا چاہے اسکے لئے ان دونوں قسم کے تصانیف کی سیر ضروری ہے ہمارے اردو لٹریچر میں تاریخی تحقیقات کا ذخیرہ بہت کم ہے۔ یہ بھی انگریزی تہذیب و تربیت کا اثر ہے کہ اکثر بزرگوں کو تاریخ لکھنے کا شوق پیدا ہوا ہے مثلاً شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب نے اکثر تاریخیں لکھی ہیں مگر ان تصانیف میں اس نقادانہ لیاقت سے کام نہیں لیا گیا ہے جو کہ فنِ تاریخ کی شان میں داخل ہے مگر نہ ہونے سے یہ تصانیف بہتر ہیں بیشک اردو میں ایک ایسی کتاب موجود ہے جس پر کہ سچی تاریخ کا اطلاق ہو سکتا ہے اس کتاب کا نام دربار اکبری ہے اور اس کا لکھنے والا ہندوستان کا مشہور مصنف محمد حسین آزاد ہے۔

زباں پر بار خدا یا یہ کس کا نام آیا کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

دربار اکبری میں محض اکبر کے زمانہ کے محاورات وغیرہ کا ذکر نہیں ہے
 بلکہ اکبر کے زمانہ کی سوسائٹی کا رنگ بھی دکھایا گیا ہے۔ اس نامور مصنف
 سے نظم اردو کی تاریخ آبجیات کے نام سے یادگار ہے یہ تاریخ بھی
 اپنے رنگ میں لاجواب ہے علاوہ ان نامی معنیوں کے اکثر حضرات نے
 چھوٹی چھوٹی تاریخیں ہندوستان کی مختلف حصوں کی لکھی ہیں اور ایک
 حد تک کامیابی بھی حاصل کی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ فن تاریخ کی دوسری
 شاخ یعنی تاریخی فسانہ نگاری نے ابھی کچھ نشوونما نہیں پائی۔ یوں تو
 ایسے فسانہ نگاروں کا ایک فرقہ پیدا ہو گیا ہے جو اپنے تئیں تاریخی فسانہ نگار سمجھتے
 ہیں مگر ابھی تک ایک بھی ایسا مصنف نہیں پیدا ہوا ہے۔ جو کہ واقعی تاریخی فسا
 نگار کے لقب کا مستحق ہو۔ میری نظر سے اکثر فسانے گزرے ہیں جن کی لوح پر
 لکھا ہوا تھا: ”کہ تاریخی فسانہ ہے“ مگر ایک فسانہ کہ پڑھنے سے بھی سن مان کے سوسائٹی
 طرز معاشرت کا پتہ نہیں چلتا تھا جس زمانہ کا ان فسانوں میں ذکر
 تھا۔ ان میں محض تاریخی واقعات درج کر دیئے گئے تھے مگر ان کے
 مصنف زمانہ دیرینہ کے مردہ قابوں میں جان نہیں ڈال سکتے تھے
 ایک فسانہ میں جو کہ عرب کے متعلق تھا اور جس میں کہ ہزار برس اُدھر کی
 تاریخ کا ذکر تھا۔ یہ واقعہ نظر سے گزرا کہ کسی شخص نے کسی کو رجسٹری کر کے
 خط بھیجا۔ حالانکہ عرب میں اب تک رجسٹری کا پتہ نہیں ہے ایک صاحب نے

اپنے تاریخی فسانہ میں کسی مغربی عورت کے عُن کی تصویر میں سیاہ اور چمکدار زلفیں بھی شامل کر دی ہیں۔ حالانکہ مغرب میں سنہرے اور گھونگھروالے بال ہوتے ہیں نہ کہ سیاہ اور چمکدار زلفیں۔ ایک بزرگوار نے اپنے تاریخی فسانہ میں جو کہ راجپوتانہ کی سوہر س اُدھر کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ راجہ کے محل میں مختلف آرائشوں کے علاوہ اپنے دماغ سے گینس کی روشنی بھی پیدا پیدا کر دی ہے۔ حالانکہ اُس زمانہ میں گینس کی روشنی کہاں۔

اس تشریح کے بعد یہ ثابت ہو گیا کہ فن تاریخ نے کس طرح ترقی کی اور کیا رنگ بدلے اور جو کچھ میں نے اس حد تک تحریر کی ہے اسی میں فن تاریخ کوں گاندھ کو راصدراصولوں کو پیش نظر رکھ کر اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو بہت سی کاوشیں رفع ہو جائیں گی مثلاً ہم پر یہ امر روشن رہے گا کہ پُرانی کتب نہ ہی جھنیں کہ ہم تقویم پارینہ خیال کرتے ہیں ایک قسم کے تاریخی سرمایہ سے کم نہیں جس سے تہذیب انسانی کی ابتدائی حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے یا مابھارت الینڈاڈلی وغیرہ ایسی تاریخی تصانیف ہیں جن میں ایسی روایتیں درج ہیں جو کہ مبالغہ سے خالی نہیں مگر جن کی اصلیت ضرور ہے۔ علاوہ بریں مطالعہ تاریخ میں ہم کو اور چند امور کا بھی خیال لازمی ہے۔ اولاً یہ کہ تاریخ پڑھنے میں ہم کو اس امر کا خیال رکھنا چاہئے کہ ہم صرف ایک کہانی یا داستان نہیں پڑھ رہے ہیں جس میں

بادشاہوں کی تخت نشینی یا مرنے جینے کے تذکرے ہیں برعکس اس کے ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ مختلف زمانوں میں انسانی اخلاق کا کیا معیار ہے جس سے کہ تہذیب کے مختلف درجوں کا اندازہ ہو سکتا ہے یا مذہبی انقلابات پر ہم کو غور کرنا چاہئے کہ کون کون مذہبی عقائد مختلف زمانوں میں سوسائٹی پر حاوی رہے ہیں اور علم طبیعیات کی ترقی کے ساتھ ان عقائد میں کیا تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں اور ان مذہبی انقلابات کے ساتھ سوسائٹی کے سوشل رسم و رواج کا کیا رنگ رہا ہے کون اصول دیرپا ثابت ہوئے ہیں اور کن کو زمانے نے فنا کر دیا ہے اس انداز پر مطالعہ تاریخ کرنے سے تاریخی زمانہ ہم کو محض ایک داستان غیر مسلسل نہ نظر آنے کا بلکہ ہم پر یہ امر آئندہ ہو جائے گا کہ اخلاقی مذہبی اور سوشل قوتوں اور ان کے نتائج کا ایک ایسا سلسلہ ہے جو کہ ازل سے شروع ہوا ہے اور اب تک قائم رہے گا۔

دوسرا مرحلہ جس کا مطالعہ تاریخ میں خیال لازمی ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو صرف بڑے بڑے واقعات کو ضروری سمجھ کر حفظ نہ کر لینا چاہئے محض بڑی بڑی لڑائیوں کی حکایتیں یا انقلاب عظیم کی داستانیں یاد کر لینے سے ہم سوسائٹی کی اندرونی یا اصلی حالت کا اندازہ نہیں کر سکتے ہیں۔ ہم کو زیادہ تر توجہ ان واقعات پر کرنا چاہئے جو کہ بادی النظر

میں غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں مگر جو دراصل قوم یا ملک کے اخلاق و عادات پر اثر کرتے آئے ہیں مثلاً علمی ترقی یا جہالت کے طرف سوسائٹی کے رجحان کا اندازہ کرنا افلاس و دولت مندی کی مختلف حالتوں پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ یہ ایسی پنہاں قوتیں ہیں جن سے کہ بڑے بڑے انقلابات نمودار ہو سکتے ہیں۔ لہذا سوسائٹی کی اصلی حالت دریافت کرنے کے لئے محض عظیم الشان واقعات پر توجہ کرنا ضروری نہیں بلکہ ان پنہانی اخلاقی اور علمی قوتوں پر غور و تعمق کی نظر ڈالنا چاہئے جن کے زوال و کمال کے ساتھ ملکوں اور قوموں کے زوال و کمال کی داستانیں وابستہ رہی ہیں اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دین اسلام کو جو کچھ فروغ ہوا ہے وہ تلوار کے زور سے ہوا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ عظیم الشان مذہب محض جبر یہ پھیلا یا گیا ہے ایسا خیال محض تاریخ اسلام کے سطحی نظارہ سے پیدا ہو سکتا ہے جن لوگوں نے عمیق نظر سے عروج اسلام کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ اسلام کے فروغ کی بانی ایک زبردست اخلاقی قوت تھی جو کہ رسول عربی کی تلقین سے ظہور میں آئی تھی اور جس نے عرب کے جاہل و حشیوں کو سرفروش اور توحید پرست مسلمان بنا دیا تھا یہ مسلمان ایمان پر جان و دولت قربان کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے اور یہی زبردست قوت اخلاقی تھی جس نے اسلام کا سکھ دُنیا میں جاری کر دیا۔ اسی طرح

اکثر حضرات کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں مرہٹوں کو جو کچھ عروج حاصل ہوا ہے وہ محض لوٹ مار کی بدولت حاصل ہوا ہے اور شیواجی محض ایک بدست لیڈر تھا۔ لیکن اگر نظر غور اور انصاف سے مرہٹوں کی حیرت انگیز ترقی کی داستان پڑھی جائے تو ثابت ہو جائیگا کہ مرہٹوں کے سینوں میں حب الوطنی کی آگ روشن تھی اور وہ محض ذاتی عروج و فائدہ کے لئے نہیں لڑتے تھے بلکہ اپنے ملک پر اپنی جان قربان کرتے تھے اور یہ زبردست اخلاقی قوت شیواجی کی بہادری اور جاں نثاری سے پیدا ہو گئی تھی جن صاحبوں نے جناب راناٹے مرحوم کی وہ لاجواب کتاب پڑھی ہے جس کا نام ”عروج سلطنت مرہٹہ“ ہے وہ میرے اس دعوے کی تائید کریں گے۔ مراد ان مثالوں کے پیش کرنے سے یہ ہے کہ محض بڑی بڑی انقلابی حالتوں کے ظاہری عنوان تک مطالعہ تاریخ میں نظر نہ محدود رکھنا چاہئے۔ بلکہ ان انقلابات کے اسباب باطنی بھی تلاش کرنے چاہئیں۔ مطالعہ تاریخ میں اس بات کی بھی سخت ضرورت ہے کہ ہر واقعہ کا اندازہ تحقیق و تمقید کی نظر سے کیا جاسکے کیونکہ اگر کسی قسم کے تعصب سے کام لیا گیا تو واقعات کی تشریح سے کبھی قابل اطمینان نتیجہ نہیں نکل سکتا بلکہ نتائج کی صحت میں فرق آ جانے سے اُلٹا سبق گمراہی کا ملتا ہے مجھے فرسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بالفعل ہندوستان میں تاریخی مطالعہ کے وقت بہت کچھ تعصب سے کام لیا جاتا ہے۔ یہاں

رسم و رواج دیرینہ کی پابندی کی بیڑیاں ایسی مضبوط ٹھکی ہوئی ہیں کہ ہر پرانی بات کو عزت کی نگاہ سے دیکھنا اصول اخلاق سمجھا جاتا ہے۔ اس کا اثر مطالعہ تاریخ پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً اکثر حضرات کا یہ شیوہ ہے کہ جب وہ قدیم ہندوستان کی تاریخ پڑھتے ہیں تو اُن کی محض یہ غرض رہتی ہے کہ جو واقعات کہ پُرانے ہندوؤں کے اخلاقی یا علمی اعزاز کے شاہد ہوں اُن کی تشریح کی جائے اور ”پدرم سلطان بود“ کا غلغلہ بلند کیا جائے اور اگر کسی طرح یہ ثابت ہو جائے کہ قدیم ہندوستان میں بھی ریل اور تار برقی کا سامان موجود تھا تو پھر کیا کہنا ہے اور جب اس وضع کے حضرات کو کسی ایسی لغزش کا سامنا ہوتا ہے جس سے کہ ہندوستان کے قدیم باشندوں کی کسی خلاقیت یا سوشل بدعنوانی کا ثبوت ملتا ہے تو یہ فکر پیدا ہوتی ہے کہ کسی طرح ان واقعات پر خاک ڈال دی جائے یا اکثر بانیان اصلاح نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جب کسی اصلاح کی عمل میں لانے کی کوشش کرتے ہیں تو اختلاف کی شورش سے بچنے کے لئے یہ چال چلتے ہیں کہ تاریخی واقعات کو توڑ مڑ کر لفظی شعبہ پر دازی سے یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ ہم کوئی بات نئی نہیں کہتے ہیں بلکہ ایک پرانی رسم تازہ کر رہے ہیں مثلاً ایک بزرگوار پردہ کے خلاف ہیں انہوں نے اپنے دلائل میں اس بے بنیاد تاریخی تصرف کو بھی شامل کیا ہے کہ مسلمانوں میں کبھی پردہ کی رسم نہ تھی ہندوستان

میں چین سے پردہ آیا اور ہندوؤں سے مسلمانان ہند نے پردہ کی رسم
 لیکھی حالانکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ ایسی کوئی قابل وقعت تاریخی شہادت نہیں
 موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہو کہ ہندوستان نے چین سے پردہ اٹرایا
 اور مسلمانوں پر ابر کی طرح چھایا اسی طرح کی اورشائیں موجود ہیں مگر یاد ہے
 کہ اصلاح قومی کی عالیشان عمارت ایسی سست بنیاد پر تیار کرنا خالی از اندیشہ
 نہیں ہے۔ ان خدا کے بندوں سے کوئی پوچھے کہ قومی اصلاح کی کوشش
 میں ایسا "دروغ مصلحت آمیز" شامل کرنے کی کیا ضرورت ہے کیا ہمارے
 بزرگ انسان نہ تھے؟ کیا ان کی تہذیب فرشتوں کی تہذیب تھی کہ اس میں
 نقص دریافت کرنا کفر میں داخل ہے۔ ان سب باتوں کو چھوڑ کر ہمارا فرض یہ
 ہے کہ تاریخ کا مطالعہ تحقیق و تنقید کی نظر سے کریں جو لغزشیں اپنے بزرگوں
 کے نظام معاشرت میں دیکھیں ان سے عبرت حاصل کریں اور ان کے تجربہ
 سے فائدہ اٹھائیں سب سے زیادہ ضروری اصول مطالعہ تاریخ کی نسبت یہ
 ہے کہ ہمیں اپنے ملک یا قوم کی تاریخ کو کل دنیا کی تاریخ سے الگ نہ سمجھنا
 چاہئے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے ملک یا قوم کی تاریخ اس عظیم الشان
 تاریخ کی ایک شاخ ہے جو کل بنی نوع انسان کی تہذیب و ترقی کی داستان
 ہے، اور جبکہ سلسلہ زمانہ قدیم میں دور تک پہنچتا ہے۔ اگر غور سے ہم تاریخ
 ماضیہ پر نظر ڈالیں تو ہم پرتاب ہو جائیگا کہ ہماری موجودہ حالت ان ہزاروں

اخلاقی اور علمی قوتوں کی مدد سے ظہور میں آئی ہے جو کہ ابتداءے آفرینش سے اب تک مختلف ملکوں اور قوموں میں کام کرتی آئی ہیں ہزاروں دل و دماغ تحقیقات علمی کے لئے وقف ہو گئے ہیں جنہوں نے مختلف ملکوں اور مختلف قوموں میں مختلف زمانوں میں تہذیب کی شمع روشن رکھی ہے اور ایک ملک کا چراغ دوسرے ملک سے جلا ہے۔ مثلاً اُس زمانہ کی سیر کر جبکہ وادی اندلس میں تہذیب کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا چین میں علم و فن کی ترقی ظہور میں آرہی تھی بابل میں تہذیب اپنا ابتدائی رنگ جہاں ہی تھی۔ پھر اُس زمانہ کی تصویر اپنی آنکھوں کے سامنے کھینچو جبکہ اُن مختلف تہذیبوں میں تعلقات باہمی شروع ہوئے۔ مختلف علم و عقل کے کارنامے اور صنعت و حرفت کے نمونے ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچے۔ غرضکہ اسی طور سے دُنیا و زبروز ترقی کرتی گئی آج ہمارے سامنے تہذیب کے وسیع باغ ہیں مختلف رنگ کے مختلف پودے اپنی اپنی بہار دکھلا رہے ہیں اور ہمارے دلوں کو سرور اور آنکھوں کو نور بخش رہے ہیں ان میں ایسے پودے بہت کم ہیں کہ جنہوں نے ابتداءے آفرینش سے اب تک ایک ہی سرزمین کی آب و ہوا میں نشوونما پائی ہو برعکس اس کے ہر ایک پودہ ایسا طے گا جس میں کسی دوسرے ملک کے پودے سے لاکھوں لگائی گئی ہے۔ دیکھو آج علم ہندسہ کس ترقی پر ہے اہل یورپ نے اس میں کیا کیا باریکیاں پیدا کی ہیں اب ہمارے اس کے تاریخ پر غور کیا جا

تو معلوم ہو جائے گا کہ اہل یورپ نے اہل عرب سے حاصل کیا ہے اور اسکی ایجاد کا سہرا ہندوستان کے سر ہے جہاں سے اہل عرب نے اسے سیکھا۔ بر گھنٹہ کے ساٹھ منٹ اور ہر منٹ کے ساٹھ سکنڈ پر تقسیم اہل بابل کا ایجاد ہے۔ آتش فشاں آلات حرب کی صنعت اہل یورپ کے ساتھ مخصوص سمجھی جاتی ہے۔ مگر اصل میں اہل چین ان کے موجد ہیں کیونکہ بارود چین ہی کا ایجاد ہے۔ فن جہاز رانی آج کس ترقی پر ہے اس کے لئے بھی ایک معنی میں اہل چین کا شکر یہ لازم ہے۔ کیونکہ قطب نما پہلے انھوں نے بنایا۔ دو رکیوں جاؤ یورپ کی موجودہ تہذیب بہت کچھ اہل عرب کے احسانوں سے گرا بنا رہے سب جانتے ہیں کہ یورپ میں پہلی یونیورسٹی مسلمانوں نے قائم کی اور مسلمانوں ہی نے پہلی رصد گاہ وہاں بنائی۔

اسی طرح اور بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں بغض کہ اس صورت پر تاریخی واقعات کا اندازہ کرنے سے یہ آئینہ ہو جاتا ہے کہ ہماری موجودہ تہذیب کل پرانی تہذیبوں کا عطر ہے اور یہ ایسا اصول ہے جو تنگ خیالی اور کم نظری کے فنا کرنے کے لئے جادو کا اثر رکھتا ہے۔ اکثر ہندو مسلمانوں کے جھگڑے ”پدرم سلطان بود“ کے ناز بجا پر قائم ہیں ہندو کہتے ہیں کہ ہم نے عادات ہندو مسلمانوں سے سیکھے اور مسلمان کہتے ہیں کہ ہم نے ہندوؤں کو اخلاق سنہ سکھائے ہیں ان سے کچھ نہیں سیکھا ہے مگر دونوں فرقوں میں

جنگلوگوں کی نظر وسیع اور جنگلوگوں کے دماغ علم تاریخ کے نور سے روشن ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندو بہت سی خوبیوں کے لئے مسلمانوں کے احسان مند ہیں اور مسلمان ہندوؤں کے جناب رانا ڈے مرحوم نے لکھنؤ میں سوشل کانفرنس کے موقع پر جو تقریر فرمائی تھی اُس میں ثابت کر دیا تھا کہ ہندوؤں نے انتظامی قابلیت اور قومی یکانگت کا اصول مسلمانوں سے سیکھا اور دماغی اور روحانی ترقی کا سبق مسلمانوں نے ہندوؤں سے لیا۔ ان واقعات پر غور کرنے سے اُن کاوشوں سے نجات مل سکتی ہے جو کہ جہل و تعصب کی وجہ سے دلوں میں پیدا ہو گئی ہیں۔

قصہ مختصر عالم تاریخ کی سیر بھی عجب روحانی سرور کا سرمایہ بہم پہنچاتی ہے اور آئینہ عقل کو جلا دیتی ہے اس عالم میں قدم رکھتے ہی تجربہ کا آفتاب نور افشاں نظر آتا ہے جس سے دل کی آنکھیں روشن ہوتی ہیں اس عالم میں تہذیب و ترقی کی وہ زبردست شاہ راہ نظر آتی ہے جس کا ایک کنارہ ازل ہے دوسرا ابد جبکہ ہر منزل پر فیض کے چشمے جاری ہیں کہیں وہ بزرگ اپنی خالقاہوں میں بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں جنہوں نے مذہب و فلسفہ کی تحقیق میں اپنی عمر صرف کر دی ہے اور طبع نورانی ایسے چراغ روشن کر گئے ہیں جنہیں ہوائے مخالف کے جھونکے نہیں بجھا سکتے اور جنگی روشنی میں اب تک بہت سے گمراہ منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں کہیں وہ بزم جادو آراستہ نظر آتی

ہے جیسے بڑے بڑے معجز نگارِ نثاروں اور شاعروں کا مجمع ہے نکتہِ نبیوں کے
گلگتے نمک رہے ہیں اور شرابِ سخن کا دور چل رہا ہے کیسے اُن قوی ہیکل
اور ضیغِ منش جوانوں کی پُر زعب صورتیں دکھائی دیتی ہیں جنگی چٹونوں سے
شجاعت کا نور برس رہا ہے اور جنگی تلواروں کے پانی سے اب تک مختلف
قوموں کے اعزاز و وقار کا جہن براہور ہا ہے اسی طرح عالمِ تاریخ میں
میرِ علم و فن کے با کمال حضرات کی زیارت کا موقع ملتا ہے اور لطف یہ ہے
کہ ادنیٰ سے ادنیٰ شخصِ عظیم الشان انسانوں کی صحبت میں بلا تکلف شریک ہو سکتا
ہے اور اپنی قابلیت کے مطابق فیض حاصل کر سکتا ہے ۔

مرزا محمد رفیع سودا

پیدائش دلی ۱۱۳۵ھ وفات لکھنؤ ۱۱۹۵ھ

مرزا سودا کے باپ مرزا محمد شفیع کابل کے رہنے والے تھے جو واکری کے وسیلہ سے دلی آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے مرزا سودا دلی میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی پہلے فارسی میں شعر کہتے تھے مگر خان آرزو کی فمائش سے اردو میں کہنے لگے اور اس زبان میں وہ بات حاصل کی کہ دلی اور لکھنؤ کے سنہن شاہوں سے استاد می کے اقرار نامے لکھوائے۔ دلی میں شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام مرزا سودا کو دکھاتے تھے۔ جب مرزا کے کلام کا شہرہ لکھنؤ تک پہنچا تو نواب شجاع الدولہ نے کمال اشتیاق سے براہ من مشفق مہربان من لکھ کر بلوایا مگر انھیں دلی چھوڑنا گوارا نہ ہوا اور معذرت میں ذیل کی رباعی لکھ بھیجی۔

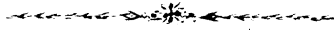
سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک

حاصل یہی ہے کہ دنیا ہووے بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

آخر کار زمانہ کے لیل و نہار نے مرزا کو دلی چھوڑ کر لکھنؤ جانے پر مجبور کیا جہاں اس وقت فیاضی اور سخاوت کی گنگا بہا بہی تھی۔ نواب شجاع الدولہ اور ان کے بیٹے آصف الدولہ نے جیسی کچھ کہ چاہئے ان کی قدر دانی کی۔ مرزا سودا نے تقریباً

متر بر سر کی عمر میں لکھنؤ میں رحلت کی۔ سودا اُردو کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں انھوں
 نے قریب قریب سب اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور غزلیں، قصیدے، رباعیاں
 متر، اور قطعات تا دینیں پھیلیاں واسخت تریج بند غزل سب کچھ لکھا ہے۔ خصوصاً بھجلیں
 ہر قسم کی نظم میں موجود ہیں لیکن اُردو میں قصائد کا کتنا اور پھر اس دھوم دھام
 سے اعلیٰ درجہ فصاحت و بلاغت پر پہونچنا ان کا پہلا فقر ہے اور شوکت الفاظ۔
 بلند پروازی اور تازگی مضامین مرزا سودا کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ زبان
 پر اس قادر الکلام کو ایسی قدرت حاصل ہے کہ کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے
 دست گریبان ہے۔ بندش اور ترکیب الفاظ ایسی کہ اگر شعر میں کوئی لفظ بھول
 جائیں تو اس کے بغیر شعر مزہ نہیں دیتا۔ مرزا سودا کا زمانہ وہ زمانہ تھا کہ جب
 اُردو زبان اپنے رنگ بدل رہی تھی اور بجا شاپرہ فارسی کا تقریباً مورہا تھا
 اسی وجہ سے ان کے میاں اکثر متر وک الفاظ اور محاورے نظر آتے ہیں تاہم ہم کو
 یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جن اشخاص نے زبان اُردو کو پاک صاف کیا ہے ان میں
 مرزا کا نمبر اول ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ان کا کلام قریب قریب تمام اصنافِ
 سخن میں ہے اور ہر صنف میں بہتات سے ہے اسوجہ سے سب کلام ہمہ پایہ
 نہیں ہے بعض نکتہ چیں کہتے ہیں کہ مرزا کے دفتر تعنیفات میں ردی بھی ہے
 اور بہت ہے او یہ شاید ان کی پُرگوئی کا نتیجہ ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے
 گلزارِ سخن میں ہجو کے کائناتوں کی ایسی کثرت ہے جس کی مثال کسی اور شاعر کے

یہاں نہیں ملتی۔ خوش اعتقاد اس کو ان کی شوخی اور مزاح کی گرمی پر محمول کریں گے
 لیکن تب بھی یہ قبول کرنا پڑیگا کہ اس صنف میں مرزا نہ صرف آئین ثقاہت
 بلکہ آداب شرم و حیا کی حد سے بھی بہت پرے جا پڑتے ہیں۔



غزلوں کا انتخاب

مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا پردہ کو تعین کے دردِ دل سے اٹھانے اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن دکھلائے لے جا کے تجھے مصر کا بازار ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ	جوں شمع سراپا ہوا اگر صرف زباں کا کھلتا ہے ابھی پل میں طلسماتِ جہاں کا جب چشم کھلی گُل کی تو موسم ہے خزاں کا لیکن کوئی خواہاں نہیں ہا جنسِ گراں کا دنیا سے گذرنا سفرِ ایسا ہے کہاں کا

برنگ میں شراب تیرے ظہور کا ہم تو نفس میں آن کے خاموش ہوئے سودا کبھی نہ مائیو و اعظا کی گفتگو	موسمی نہیں جو سیر کروں کوہِ طور کا اسے ہم صیفِ فائدہ ناحق کے شور کا آوازہ دہل ہے خوش آئینہ دور کا

وہی جہاں میں رموزِ قلندرِ جانے غلام اُسکی میں جنت کا ہوں کہ جو اپنے فیم ہے وہی آفاق میں ترا جو یا زباں دہن میں تو غنچے کے بھی بے کیا لازم اکسی گدائے نسا ہے یہ ایک شہ سے کہا	بھجھوت تن پہ جو لبوسِ قیصری جانے جگر کے خون کو خون تو نگرے جانے کہ جس میں پائے تجھے اُسے بہری جانے کہ جس کے مُنہ میں زباں ہو غنچہ زبانی کروں میں عرض گراں کو نہ سرسری جانے

گدا نوازی و درویش پروری جانے برایک غور و دو کلال میں برابری جانے کہ جس میں عامۃ خلقت کی بہتری جانے کہ جس سے کار خلائی کی اتہری جانے مساوی ازا م راتا بہ لشکری جانے	امور ملکی میں اول ہے شہ کو یہ لازم مقام عدل چس دم سریر آرا ہو وہی رالے مبارک میں اس کے گوشہ نشین ملازموں سے نہ لاوے یہ اس کو برہکار ہمیشہ جو دو کرم میں سمجھ ہر ایک کی قدر

بہت سار دیئے ان کو جو اس جینی پرتیں	کسی کی مرگ پہ سودا نہ کیجے چشم تر ہر گز

منجس شہر آشوب

کما میں آج یہ سودا سے کیوں توڈا نواں ڈول
پھرے ہی جا کہیں نوکر ہو لے کے گھوڑا مول
لگا وہ کہنے یہ اُس کے جواب میں دو بول
جو میں کہوں گا تو سمجھ کا تو کہ ہے یہ ٹھٹھول
بتا کہ نوکری کہتی ہے ڈھیریوں یا تول
پا ہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند
سوا آمد ان کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند

کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند
 جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
 رہے نہ اس کے تصرف میں فوجداری کو لے
 امیر اب جو ہیں دانا انہوں کی ہے یہ چال
 ہوئے ہیں خانہ نشین دیکھ کر زمانے کا حال
 بچھی ہے سوزنی خواجہ کھڑا جھلے ہے رومال
 حضور بیٹھے ہیں ایک دو ندیم اہل کمال
 دھری ہے روبرو اک پیکداں واک تنول
 نہ صرف خاص میں آمد نہ خالصہ جاری
 سپاہی تا تصدی سبھوں کو بے کاری
 اب آگے دفتر تن کی میں کیا کموں خواری
 سوال و تخطی لکھ پھاڑ کر کے پٹناری
 کسی کو آنولہ دے باندھ کر کسی کو کٹول
 کرے ہے بھوک سے شاگرد پیشاب یہ معاش
 کہیں پلاڈ تو باد رچی وہاں پکا دے آتش

کریں قناتوں میں دربان بیٹھے پردہ فاش
 تلے کھینچے مسند کو آن کر فساد
 اگر کہیں کہ مٹا اٹھ کے چاندنی کا بھول
 غرض مال ہے اس گفتگو سے یہ میرا
 کہ بے زر می نے جب ایسا گھر آن کر گھیرا
 تو کوئی قصد کرے نوکری کا بہتیرا
 نہیں یہ فائدہ کچھ تا وہ چھوڑ کر ڈیرا
 کرے نہ عزم سوے اصفہان و استنبول
 سخن جو شہر کی ویرانی سے کروں آغاز
 تو اس کو سن کے کریں ہوش چند کے پرواز
 نہیں وہ گھر نہ ہو جس میں شغال کی آواز
 کوئی جو شام کو مسجد میں جاے بہر نماز
 تو وہاں چہراغ نہیں ہے بجز چراغ غول
 خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجسہ پاس
 کہ جس کے دیکھے سے جاتی رہے تھی بھوک و پیاس
 اور اب جو دیکھو تو دل ہوئے زندگی سے اُداس
 بجائے گل چمنوں میں کمر کر ہے گھاس

کیس ستون پڑا ہے کیس پڑے مرغول
 یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم
 نہ جانے کن نے رکھایا قدم وہ کون تھا شوخ
 جہاں تھے سرو و صنوبر وہاں اُگے ہے زقوم
 پُچی ہے زاغ و زغن سے اب اسن من میں دھوا
 گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھی کلول
 جہاں آباد تو کب اس تم کے قابل تھا
 مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
 کہ یوں اُٹھا دیا گویا کہ نقش باطل تھا
 عجب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا
 کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول
 بس اب نموش ہو سدا کہ آگے تاب نہیں
 وہ دل نہیں کہ اب اس غم سے جو کباب نہیں
 کسی کی چشم نہ ہوگی کہ وہ پڑا ب نہیں
 سوائے اس کے تری بات کا جواب نہیں
 کہ یہ زمانہ ہے اس طرح کا زیادہ نہ بول

میر تقی میر

پیدائش اکبر آباد ۱۲۵۰ھ

وفات لکھنؤ ۱۲۲۵ھ

میر تقی نامہ مختص۔ اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ باپ کے مرنے کے بعد دہلی گئے اور ۱۲۱۵ھ میں دہلی سے لکھنؤ آئے۔ کہتے ہیں کہ لکھنؤ پہونچکر ایک سرائے میں قیام کیا معلوم ہوا کہ ایک جگہ مشاعرہ ہے فوراً غزل لکھ کر مشاعرہ میں شامل ہوئے جب میر صاحب محفل میں داخل ہوئے تو اکثر اہل مشاعرہ ان کی قدماء وضع پر مسکرائے اور بعض نے وطن پوچھا۔ میر صاحب نے ان کے جواب میں ذیل کا قطع پڑھا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو یورپ کے ساکنو ہم کو غریب جان کے ہنسٹیں بچار کے
دہلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیکھ کے
جب نواب آصف الدولہ کو معلوم ہوا تو دو سو روپیہ مہینہ کر دیا لیکن میر صاحب
کی نازک مزاجی اور بد دماغی مزب الشہ ہے دربار کی پابندیوں کا بوجھ بھلا ان سے
کب اٹھ سکتا تھا کچھ دن بعد کسی بات پر بگڑ کر دربار کا جانا چھوڑ دیا۔ فقر و فاقہ
میں گزارہ کرتے رہے آخر ۱۲۲۵ھ میں انتقال کیا۔ شیخ ناجی نے تاریخ گہی ۶

واو یلا مرد شہ شاعراں

میر صاحب کی زبان نہایت شستہ و زمرہ نہایت صاف اور کلام نہایت

سلسلہ ڈبلیجا ہوا ہے۔ ساری عمران کی معیبت اور غم میں گزری۔ حسرت مایوسی اور ناکامی کا ڈکھڑا ایشیا کے سبھی شاعر روتے ہیں فرق یہ ہے کہ اور جگہ بیتی کہتے ہیں اور میر آپ بیتی۔ یہی وجہ ہے کہ کلام ایسا پُر درد اور پُر تاثیر ہے کہ سُسنے والوں کے دلوں پر نشتر کا کام کرتا ہے مرزا سودا میر تقی کے ہم عصر تھے نقادان سخن کی رائے ہے کہ جو مرتبہ مرزا کا قصیدوں میں ہے وہی مرتبہ میر کا غزل میں ہے۔ چنانچہ مولوی محمد حسین صاحب آزاد دونوں استادوں کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ دراصل حقیقت یہ ہے کہ غزل ثنوی وغیرہ اقسام شعر میں ہر کو چہ کی راہ جدا جدا ہے۔ جس طرح قصیدہ کے لئے شکوہ الفاظ اور بلندی معنایں چتی ترکیب وغیرہ لوازمات ہیں اسی طرح غزل کے لئے عاشق معشوق کے خیالات عشقیہ، کرم صفت شکایت فراق درد انگیز اور المناک حالت آفنگو ایسی بے تکلف صاف صاف نرم نرم گویا وہی دونوں بیٹھتے کر رہے ہیں اس کے اداس معنایں کے لئے الفاظ بھی اور ہیں اور اسکی بھر میں بھی خاص ہیں۔ میر صاحب کی طبیعت درد خیز اور دل حسرت انگیز تھا کہ غزل کی جان ہے۔ اس نے ان کی غزلیں ہی ہیں اور خاص خاص بحر و قوافی میں ہیں مرزا کی طبیعت ہمہ رنگ اور ہمہ گیر۔ ذہن بلاق اور زبان عشاق رکھتے تھے۔ توسن نکران کا منہ زور گھوڑے کی طرح جس طرف جاتا تھا رُک نہ سکتا تھا۔ کوئی بحر اور کوئی قافیہ ان کے ہاتھ

آئے۔ تَفْزَل کی خصوصیت نہیں رہتی تھی۔ جس پر جتہ مضمون میں بندہ جاتے بانہہ دیتے تھے بیشک اُن کی غزلوں کے بھی اکثر شعر سُتی اور درستی میں قصیدہ کا رنگ دکھاتے ہیں۔ ایک دن لکھنؤ میں تیر اور میرزا کے کلام پر دو شخصوں میں تکرار نے طول کھینچا۔ دونوں خواجہ باسطا کے مرید تھے اُنھیں کے پاس گئے اور عرض کی آپ فرمائیں۔ اُنھوں نے کہا کہ دونوں صاحب کمال ہیں مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام آہ ہے اور مرزا کا کلام واہ ہے۔ مثال میں میر صاحب کا شعر پڑھا۔

مرہائے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹلک روتے روتے سو گیا ہے
پھر مرزا صاحب کا شعر پڑھا۔

سودا کی جو باین پر کیا شور قیامت خدام ادب بولے ابھی آگکھ لگی ہے

غزلوں کا انتخاب

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا پہونچا جو آپ کو تو مین پہنچا خدا کے تئیں آتشِ بلند دل کی نہ تھی ورنہ لے کلیم کل پاؤں ایک کاسٹہ سر پر جو آگیا	پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا یک شعلہ برقِ خرمن صد کوہِ طور تھا قطعہ یکسر وہ اتخوانِ شکستہ سے چور تھا

کنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر میں بھی کبھی کسی کا سر پر غور تھا
 تھا وہ تو رشک حورِ بشتی ہمیں میں میرے سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا
 اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کا کام کیا
 دیکھا اس بیمار نے دل نے آخر کام تمام کیا
 عہدِ جوانی رو رو کا نا پیری میں لیں آنکھیں موند
 یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
 ناحق ہم مجبور دل پر یہ قسمت ہے مختاری کی
 چاہتے ہیں سو آپ کر میں ہیں ہم کو عبث بنام کیا
 یہاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے تو اتنا ہے
 رات کو رو رو صبح کیا۔ یادِ ن کو جوتوں شام کیا
 میرے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُنے تو
 قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترکِ اسلام کیا

دم کے جانے کا نہایت غم رہا
 قطرہ خوں تھا مژہ پر جم رہا
 تھا حرم میں ایک نا محرم رہا
 تو نہ چیتیاں بہت دن کم رہا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
 دل نہ پہونچا گوشہءِ داماں تلک
 جامہءِ احرام زاہد پر نہ جا
 صبح پیری شام ہونے آئی میسر

حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا دل ہوا ہے چسراغِ مفلس کا آج دامنِ وسیع ہے اس کا حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا	مُنہ نکاہی کرے ہے جس تس کا شام سے کچھ بچھا سا رہتا ہے فیض اے ابر چشم تر سے اٹھا تاب کس کو جو حال میسر نئے
دل کی صورت کا بھی اے شیشہ گراں شیشہ ہر طرح کا جو تو دیکھ ہے کیا ہے شیشہ شکل شیشہ کی بنائی ہے کہاں ہے شیشہ	جا کے پوچھا جو میں یہ کارگہ مینا میں ق کنے لاگے کہ کدھر پھرتا ہے بکالے مست دل ہی سارے تھے یہ ایک وقت میج کر گنار
آساں سے زمیں پہ پناہی ہو گیا دن تمام رات آئی اسکے خاطر ہوئے ہیں سودا رنگ رنگ اسکو چیز پہونچائی لطف حق نے کی یہ عزت افزائی خود سری خود ستائی خود رائی یہ بھی کرتا سدا جبیں سائی	بات کیا آدمی کی بن آئی چنچ زن اسکے واسطے ہے مدام ماہ و خورشید اب اسد سبھی کیسے کیسے کئے تردد جب اس کو ترجیح سب کے اوپر دی حیرت آتی ہے اس کی باتیں دیکھ شکر کے سجدوں میں یہ واجب تھا

موسم ہے نکلے شاخوں سے پتے ہرے ہرے
 پودے چمن میں پھولوں سے دیکھے بھر بھر
 آگے کو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
 وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

جھٹ پٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھیرا
 صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھیرا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا	آگے آگے دیکھے ہوتا ہے کیا
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمین	تخم خواہش دل میں تو ہوتا ہے کیا
غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز	میر اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا



خواجہ حیدر علی آتش

پیدائش دہلی سنہ نامعلوم وفات لکھنؤ ۱۲۶۳ھ

ان کے باپ خواجہ علی بخش دہلی کے رہنے والے تھے خواجہ آتش نے دہلی چھوڑ کر پہلے فیض آباد پھر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔ بھولے بھالے سید سے سادے آدمی تھے آزادانہ انداز اور رندانہ وضع رکھتے تھے۔ اتنی روپیہ ماہانہ بادشاہ لکھنؤ کے یہاں سے ملتا تھا۔ جاہ و جنت ظاہری سے انکی طبیعت نفور تھی۔ اُنھوں نے کبھی امرا اور سلاطین کی مدح میں قصیدے نہیں کہے اور ہمیشہ شان و شکوہ دنیوی کو پیچ بھجھا شیخ امام بخش ناسخ ان کے ہمعصر تھے اور کبھی کبھی دونوں استادوں میں معاملہ نہ ٹوک جھوک بھی ہو جاتی تھی۔ زبان کے صیغہ میں لکھنؤ کو دہلی کی مطابعت سے آزاد کرنے کا سہرہ انھیں دونوں استادوں کے سر ہے۔

خواجہ آتش نے غزل کے میدان سے باہر قدم نہیں رکھا لیکن اس میں جو کچھ کہا وہ ایسا کیا کہ اُردو و غزل کو معراج پر پہنچا دیا اس معنی میں اگر انکو اُردو کا حافظ کہا جائے تو بیجا نہیں۔ آتش کی زبان اُردو کا پاک اور لطیف سرچشمہ ہے جس سے کشت زار سخن میں آبیاری ہوتی ہے ان کا کلام محاورہ

اُردو کا دستور العمل ہے اور شرفاء لکھنؤ کی بول چال کا اعلیٰ نمونہ ہے یہاں تک ہی
 اس کے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آتش کے یہاں باتیں ہی باتیں ہیں کیونکہ لکھنؤ
 یہاں شاعری کے دوسرے محاسن بدرجہ اتم موجود ہیں۔ تصوف اور روحانیت
 کی چاشنی نے خواجہ کے اشعار میں ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔ کلام میں
 استعارہ اور تشبیہ کی پختگی کلام کی تاثیر ہی کو نہیں بڑھاتی بلکہ شاعر کی باریک
 بینی اور نازک خیالی کا پتہ دیتی ہے۔ جذبات انسانی کی تصویر کھینچنے میں اس
 استاد نے الفاظ سے جو صنّاعی کی ہے وہ بند کی انشا پر دازی کے لئے ایذا
 ہے۔ چنانچہ خواجہ صاحب خود ایک مقام پر فرماتے ہیں :-

بند شاعر الفاظ جڑنے سونگوں کے کہ نہیں شاعری بھی کام ہے آتش مرقع ساز کا

غزلوں کا انتخاب

حباب آسائیں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا تعلق روح سے مجھ کو جسد کا ناگوارا ہے ہونٹی منظور محتاجی نہ تجھ کو اپنے سائل کی نظر آتی ہیں ہر صورتیں ہی صورتیں تجھ کو شکستِ خاطر احباب ہوتی ہے درست اسے	نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا زمانہ میں چلن ہے چاروں کی آشنائی کا بنایا کاغذ سر و اڑگوں کا سہ گدائی کا کوئی آئینہ خانہ کار خانہ ہے خدائی کا توجہ میں تری اے یا ر اثر ہے مومیاں کا

ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا
 بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اُس کا
 معلوم ہوا سوختہ پروانہ ہے اُس کا
 معمورۂ عالم جو ہے ویرانہ ہے اُس کا
 جو سینہ صد چاک ہوا نشاءِ پیاس کا
 عرصہ یہ دو عالم کا جلو خانہ ہے جس کا
 حالت کوکھے سے غمزدہ یا رانہ ہے اُس کا
 قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہو اُس کا
 جامے سے جو باہر ہے وہ دیوانہ ہو اُس کا
 آلودہ دنیا جو ہے بیگانہ ہے اُس کا
 لبریز مئے شوق ہے پیادہ ہے اُس کا

حسن پر ہی ایک جلوہ مستانہ ہے اُس کا
 گل آتے ہیں مستی میں عدم سے بہت گشت
 گریاں ہے اگر شمع تو مرقضتا ہے شعلہ
 وہ شوخ نہاں گنج کے مانند ہے اس میں
 جو چشم کہ حیراں ہوئی آئینہ ہے اُس کی
 دل قہر شنشہ ہو وہ شیخ اس میں شہنشاہ
 وہ یاد ہے اسکی کہ بھلا دے دو جہاں کو
 یوسف نہیں جو ہاتھ لگے چند درم سے
 آوارگی نکست گل سے ہے اشارہ
 یہ حال ہو اُس کے فقیروں سے ہویدا
 شکرانہ ساتی ازل کرتا ہے آتش

تو اُس نے منزل مقصود کو زیرِ قدم پایا
 شرارِ دبرت سے بھی عرصہ ہستی کو کم پایا
 غنیمت جان جو آرام تو نے کوئی دم پایا
 صفائے قلب پہلو میں ہم نے جامِ جہم پایا

برنگِ شمع جس نے دلی جلا یا تیری دور میں
 ہزاروں مسرتیں جائیگی میرے ساتھ دنیا
 سوائے رنجِ کچھ حاصل نہیں ہے اس خراب میں
 نظر آیا تماشا ہے جہاں جب بند کیسی لکھیں

رنجور کا انیس ہے ہمد م عیسیٰ کا
مشکل کے وقت حامی ہوا تو عیسیٰ کا
فرعون کو تو نے غرق کیا رو نیل کا
حقا جواب ہی نہیں تجھ سے کفیل کا
محتاج اے کترم نہ کجو بنجیل کا

عاجز نواز دوسرا تجھ سا نہیں کوئی
باغ و بہار آتش نمرود کو کیا
موسیٰ کو تیرے حکم سے دریا نے راہ دی
طوفان میں ناخدائی کشتی نوح کی
آتش یہی دُعا ہے خداے کریم سے

کتنی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا
قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا
ممیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا
دل صاف ہوا ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا
دیکھو تو موت ڈھونڈھ رہی ہو کیا
رستم کی داستان ہوا اپنا فسانہ کیا

سُن تو سی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سوز ربیع
اُڑتا ہے شوقِ راحت منزل سے اس پیغمبر
چاروں طرف سے صورتِ جانان بھلہ کیا
طبل و علم بھگے پاس چھپنے نہ ملک مال
آتی ہے کس طرح سے مری قبضِ روح کو
ہوتا ہے زرد دُسن کے جو نامرد مدعی

نوٹ - غزل مذکور العبدِ ایک خاص موقع پر کہی گئی تھی جس کو صاحبِ آبِ حیات
یوں بیان فرماتے ہیں ایک نواب صاحب کے یہاں مشاعرہ تھا وہ اُن کے (شیخِ ناسخ کے) مقتدر
تھے انھوں نے ارادہ کیا کہ شیخِ ناسخ جب غزل پڑھ چکیں تو انھیں سرِ مشاعرہ غلت دیں

یار لوگوں نے خواجہ صاحب کے پاس مصرع طرح نہ بھیجا۔ انھیں اُس وقت مصرع پہونچا جب ایک دن مشاعرہ میں باقی تھلا خواجہ صاحب بہت خفا ہوئے اور کہا کہ اب لکھنؤ رہنے کا مقام نہیں ہم نہ رہیں گے۔ شاگرد جمع ہوئے اور کہا کہ آپ کچھ خیال نہ فرمائیں نیاز مند حاضر ہیں دو دو شو کہیں گے تو صد ہا شعر ہو جائیں گے وہ بہت تمد مزاج تھے ان سے بھی دلی تقویٰ کرتے رہے۔ شہر کے باہر چلے گئے۔ پھرتے پھرتے ایک مسجد میں جا بیٹھے وہاں سے غزل کہہ لائے اور مشاعروں گئے تو ایک قزاق بھی ابھر کر لیتے گئے۔ بیٹھے ایسے موقع پر کہ عین مقابل شیخ صاحب کے تھے۔ اول تو آپ کا انداز ہی بانگے سپاہیوں کا تھا اُس پر قزاقین بھری سامنے رکھی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ خود بھی بھرے بیٹھے ہیں۔ بار بار قزاقین اٹھاتے تھے اور رکھ دیتے تھے۔ جب شمع سامنے آئی تو سنبل کر ہو بیٹھے اور شیخ صاحب کی طرف اشارہ کر کے پڑھا۔

مُن تو سی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا کتنی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

اس ساری غزل میں کہیں ان کے لے پالک ہونے پر کوئیں ذخیرہ دولت پر کہیں انکے سامان امارت پر غرض کچھ نہ کچھ چوٹ مزدور ہے۔ شیخ صاحب بیچارے دم خود بیٹھے رہے۔ نواب صاحب ڈرے کہ خدا جانے یہ ان پر قزاقین خالی کریں یا میرے پیٹ میں آگ بھر دیں اسی وقت داروغہ کو اشارہ کیا کہ دوسرا خلعت خواجہ صاحب کے لئے تیار کر دو۔ غرض دونوں صاحبوں کو برابر خلعت دے کر رخصت کیا۔

دکھایا آئینہ فکر نے جب صفائے آبِ در سخن کا
 دہن کو جو ہر کھلا زباں کا زباں کو عقدہ کھلا دہن کا
 برہنہ آیا تھا یاں عدم سے برہنہ یاں چلا عدم کو
 نہ بونے کا فور میں نے سو نگھنی نہ داغِ نمجہ کو لگا کفن کا
 خراب منی نہ ہو کسی کی کوئی نہ مردود دوستاں ہو
 جدا ہوا شاخ سے جو پتا غبارِ خاطر ہوا چمن کا

نہ بونے کا فور میں نے سو نگھنی نہ داغِ نمجہ کو لگا کفن کا خراب منی نہ ہو کسی کی کوئی نہ مردود دوستاں ہو جدا ہوا شاخ سے جو پتا غبارِ خاطر ہوا چمن کا	نہ بونے کا فور میں نے سو نگھنی نہ داغِ نمجہ کو لگا کفن کا خراب منی نہ ہو کسی کی کوئی نہ مردود دوستاں ہو جدا ہوا شاخ سے جو پتا غبارِ خاطر ہوا چمن کا

نشد دولت سے منعم پیرہن میں مست ہے
 مرد مفلس حالتِ رنج و محن میں مست ہے

دور گردوں ہے خداوند کہ یہ دور شراب
دیکھتا ہوں جس کو میں اس انجن میں مست ہے

زمین یاں کی چہارم آسماں ہے نہاں ہے گنج ویرانہ عیاں ہے یہ آئینہ سکندر کا مکاں ہے قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے قناعت بھی بہارِ بے خنزاں ہے	یہ کس رفک سیمکا مکاں ہے خدا پنہاں ہے عالم آشکارا دل روشن ہے روشنگر کی منزل تکلف سے بری ہے حسن ذاتی شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ
گر یہاں پھاڑتا ہے تنگ جبے لیوانا ہے خیال آبروئے ہمت مردانہ آتا ہے کسے اس انجن میں یاد خلوت خانا ہے کئی شب سے ہمارے خواب میں بخانا ہے مقام آشناہیاں نہیں بیگانہ آتا ہے	خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہونیں سکتی طلب دنیا کو کر کے زن مریدی نہیں سکتی شام شاگاہ ہستی میں عدم کا دھیان ہو کس کو زیارت ہوگی کعبہ کی ہی تعمیر ہے اس کی خدا کا گھر ہے بخانا ہمارا دل نہیں آتش

خنزاں چمن سے ہے جاتی بہارِ راہ میں ہے نہ کوئی شہر نہ کوئی دیارِ راہ میں ہے عنان گستہ و بے اختیارِ راہ میں ہے	ہوا سے دور مئے خوشگوارِ راہ میں ہے عدم کے کوچ کی لازم ہے فکرِ ہستی میں سمندِ عمر کو اندر سے شوقِ آشنائش

فقط عنایت پروردگار راہ میں ہے ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے خدا تو دوست ہوشمن ہزار راہ میں ہے گل مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے	نہ بدرقہ ہے نہ کوئی رفیق اپنے ساتھ سفر ہے شرمناک مسافر نواز بہتیرے مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بن ٹھہر آتش
منزل ہزار سخت ہو جہت نہ ہار بیٹے پھیلانے نہ ہاتھ نہ دامن پسار بیٹے زر کی طمع سے چھانتے ہیں خاک نیار بیٹے کون آشنائے حال ہے کس کو کار بیٹے	سرفراز ساں کٹائیے پر دم نہ مار بیٹے مقسوم کا جو ہے سودہ پہنچے گا آپ سے طالب کو اپنے رکھتی ہے دنیا ذلیل و خوار تنہائی ہے غریبی ہے صحرا ہے خار ہے
سانپ کو مار کے گنجینہ زار لیتا ہے زہری کر مڑہ شیر و شکر لیتا ہے بادشہ تخت سے یاں اپنے اُتر لیتا ہے موت سے جان چھپانے کو سیر لیتا ہے آشنا کوئی نہیں کون خبر لیتا ہے	کام ہمت سے جو اُتر د اگر لیتا ہے ناگوارا کو جو کرتا ہے گھدا انسان منزل فقر و فنا جائے ادب ہے غافل عقل کر دیتی ہے انسان کی جہالت نازل غیرت نالہ و فریاد نہ کھو اے آتش

میرزا اسد اللہ خاں غالب

غزلوں کا انتخاب

محرم نہیں ہے تو ہی نواہئے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

در و منت کشِ دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا
کیا وہ نمود کی خدائی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈوبو یا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہو دریا لیکن ہم کو تقلیدِ تنکِ ظرفیٰ منصور نہیں

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہیں ہوں لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں بلبلیں سن کر میرے نامے غولخواں ہو گئیں ملتیں جب مٹ گئیں اجڑاے ایماں ہو گئیں مشعلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں	سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں یا دھتیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں میں چہن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا ہم موچہ ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم رہ سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا رہنچ
دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشتِ دردت بھرنے آئے کیوں روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں ویر نہیں حرم نہیں در نہیں آستان نہیں بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں	
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرا دل ہے یہ جواک لذت ہمارے سعی بے حاصل میں ہے	دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائیگی
کوئی صورت نظر نہیں آتی نیند کیوں رات بھر نہیں آتی اب کسی بات پہ نہیں آتی	کوئی امید بر نہیں آتی موت کا ایک دن معین ہے آگے آتی تھی حال دل پھنسی

پر طبیعت ادھر نہیں آتی ور نہ کیا بات کر نہیں آتی کچھ ہماری خبر نہیں آتی موت آتی ہے پر نہیں آتی شرم تم کو مگر نہیں آتی	جاتا ہوں ثواب طاعتِ زہد ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ہم وہاں ہیں جہاں سو ہلکو بھی مرتے ہیں آواز میں مرنے کی کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
تا اُمید سی اُس کی دیکھا چاہئے	منحصر مرنے پہ جو جس کی اُمید
نالہ پا بند نے نہیں ہے پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے گدہ ہر چند کہیں کہے نہیں ہے	فریاد کی کوئی کے نہیں ہے ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے ہاں کھائی موت فریب ہستی
پر دے میں گل کے لاکھ جگر چاک گئے	کتنا ہے کون نالہ بلبیل کو بے اثر
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے	ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خوشی نیک

قطعات

رہنے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو	ہم نین کوئی نہ ہوا اور ہم زبان کوئی نہ ہو
بے درو دیوار سا لکھ بنایا چاہئے	کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاساں کوئی نہ ہو
پڑے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیسرا در	اور اگر م جائے تو نو نہ خواں کوئی نہ ہو

اسے تازہ واردان ہوائے بساط دل	ترنہ را اگر تمہیں ہو پس نائے دلوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدہ عسرت نگاہ ہو	میری سُنو جو گوش نصیحت نبوش ہے
ساتی بسلوہ دشمن ایمان و آگہی	مطرب بہ نغمہ رہزن تکمین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط	دامان باغبان و کف کل فروش ہے
لطف خرام ساتی و ذوق صد چنگ	یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے
یا مجسم جو دیکھتے آکر تو بزم میں	نے وہ سرور سوزنہ جوش فروش ہے
داغ ذاق صحبت شب کی جلی ہوئی	اک شمع رہ گئی ہے سودہ بھی نموش ہے

قصائد کا انتخاب

صبح دم دروازہ خس اور گھلا	مہر عالم تاب کا منظر گھلا
خس و انجم کے آبا صرف میں	شب کو تھا گنجینہ گوہر گھلا

وہ بھی تھی اک سیما کی سی نمود
 ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
 سطح گردوں پر پڑ اتمھارات کو
 صبح آیا جانب مشرق نظر
 تھی نظر بندی کیا جب رو سحر
 لاکے ساتی نے صبوحی کے لئے
 بزم سلطانی ہوئی آراستہ
 تاج زرین مہتاباں سے سوا
 شاہ روشن دل بہادر شہ کہ ہے
 وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں
 وہ کہ جس کے ناخن تاویل سے
 پہلے دار اکا نخل آیا ہے نام
 روشناسوں کی جہاں فہرست ہے
 توسن شہ میں وہ خوبی ہے کہ جب
 نقشِ پاکی صورتیں وہ دلفریب
 مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے
 لاکھ عقدے دل میں ہیں لیکن بڑا

صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا
 دیتے ہیں دھوکا یہ باز گیر کھلا
 موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
 اک نگارِ آتشیں رُخ سر کھلا
 بادہ کازنک کا ساغر کھلا
 رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا
 کعبۂ امن و اماں کا در کھلا
 خسرو آفاق کے منہ پر کھلا
 راز ہستی اُس پہ سترتا سر کھلا
 مقصد نہ چرخ و ہفت اختر کھلا
 عقدہ احکام پیغمبر کھلا
 اُس کے سر ہنگوں کا جب قرعہ کھلا
 واں لکھا ہے چہرہ قیصر کھلا
 کھان سے وہ غیرتِ قرعہ کھلا
 تو کہے بُت خانہ آذر کھلا
 منصبِ مہر و مہر و محور کھلا
 میری جدو جہ سے باہر کھلا

کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا مجھ سے گر شاہ سخن گستر کھلا پھر مر و خورشید کا دفتر کھلا باد باں بھی اُٹھتے ہی لنگر کھلا بادشہ کا رایت لشکر کھلا اب مال سسی اسکندر کھلا اب فریب طغرل و سنجر کھلا دفتر مدح جہاں داور کھلا عجز اعجاز سائش گر کھلا تم پہ اس خاقان نام آور کھلا بہ ظلم روز و شب کا در کھلا	تھا دلِ وابستہ قفل بے کلید باغِ معنی کی دکھا دوں گا بہار پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال خانے نے پائی طبیعت سے مدد مہر کا نیا چرخ چکر کھا گیا شاہ کے آگے دھڑاتے آئینہ ملک کے دار شکوہ دیکھا خلق نے ہو سکے کیا مدح ہاں ک نام ہے فکر اچھی پرستائش نام تمام جانتا ہوں بے خط لوحِ ازل تم کرو صاحبِ قرانی جب ملک
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام یہی انداز اور یہی اندام بندہ عاجز ہے گردشِ ایام آسمان نے پچھار کھا تھا دام جہذا سے نشاطِ عام عوام	ہاں مہ نوپائیں ہم اُس کا نام دودن آیا ہے تو نظر دمِ ضعیف باسے دودن کہاں رہا غائب اڑ کے جانا کہاں کتہ ماروں کا مرجبا سے سرور خاص خواص

عذر میں تین دن نہ آنے کے
اُس کو بھولانہ چاہئے کسنا
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
راز دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
میں نے مانا کہ تو ہے حالتہ بگوش
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
مہر تاباں کو پہنچو اسے ۱۰ ماہ
تجکو کیا پایہ روشناسی کا
جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو
ماہ بن، مہتاب بن، میں کون
میرا اپنا جدا معاملہ ہے
ہے مجھے آرزوئے بخشش خاص
جو کہ بخشے گا تجکو فسر، فسر و غ
جب کہ چودہ منازلِ فلکی
تیرے پر تو سے ہوں فروغ پذیر
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز

لے کے آیا ہے عید کا پیغام
صبح جو جائے اور آئے شام
تیرا آغاز اور ترا انجام
مجھ کو سمجھا ہے کیا کسین نام
ایک ہی ہے امید گاہ انا م
غالب اُس کا مگر نہیں ہے غلام
تب کہا ہے بطرز استنہام
قرب بر روزہ بر سبیلِ دوام
جز بتقریب عید ماہِ صیام
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
تجکو کیا بانٹ دے گا تو انعام
اور کے لین دین سے کیا کام
گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام
کیا نہ دے گا مجھے کفِ عالم
کر چکی قطع تیری تیزے گام
کوے و مشکوے صحنِ منظرِ عام
اپنی صورت کا اک بلوریں جام

مطلع ثانی

کہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ کون ہے جس کے در پر ناصیہ سا تو نہیں جانتا تو نجد سے سن قبلہ چشم و دل بہادر شاہ شمسوار طریقہ انصاف جس کا بر فیل صورتِ انجاز رزم میں میسر بان قیصر و جم اے ترا لطف زندگی افزا جاں نثاروں میں تیرے قیصر و جم وارث ملک جانتے ہیں تجھے زور بازو میں مانتے ہیں تجھے وجہاں مویشا گائے ناوک تیر کو تیرے تیر غیسر ہن رعد کا کرہ ہی ہے کیا دم بند تیرے فیل گراں جمد کی صدا	اے پری چہرہ پیک تیرے خرم میں مد و مسرور بہرہ و بہرام ہام شاہنشاہ بلند مقام مظہر ذوالجلال والا کرام نو بہار حلیقہ اسلام جس کا ہر قول معنی المسام رزم میں استادِ ستم و سام اے تیرا عہد فرخی فرح بام جرمہ خواروں میں تیرے رشجام ایرج و تور و خسرو بہرام گیو و گودرز و بیزن و ربام آفریں آبدارے مصما تیغ کو تیرے تیغ خصم پیام برق کو دے رہا ہے کیا الزام تیرے رخس سبک غناں کا خطام

آم کی تعریف

کیوں نہ کھولے درِ حسرتِ راز
شاخِ نخل کا ہے کلفشاں ہونا
نکتہ ہائے خردِ فترا لکھئے
خامہ نخلِ رطبِ فشاں ہو جائے
ثمر و شاخِ گوے و چوگاں ہے
آے یہ گوے اور یہ میساں
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
بادۂ ناب بن گیا انگور
شدرم سے پانی پانی ہونا ہے
آم کے آگے نیشکر کیا ہے
جب خزاں آئے تب ہوا کی بہار
جان شیریں میں یہ مٹھاس کہاں
کہ دو احسانہ ازل میں مگر
شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام
باغبانوں نے باغِ جنت سے

ہاں دلِ درِ مسندِ زمزمہ ساز
خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھئے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میساں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے اراں
آم کے آگے پیش جانے خاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدر
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے
مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے
نہ نخل اس میں نہ شاخ و برگِ بار
اور دوڑائیے قیاس کہاں
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ شمر
آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام
یا یہ ہو گا کفرِ طرافت سے

بھڑکے بھیجے ہیں سر بہ مہر گلاس
مَدّتوں تک دیا ہے آبِ حیات
ہم کہاں ورنہ اور کس انجیل
نارِشِ دودمان آب و ہوا
طوبی دسدرہ کا جگر گوشہ
ناز پروردہ سہار ہے آم

انگیں کے بہ حکم رب الناس
یا خضر نے لگا کے شاخ نبات
تب ہوا ہے شرفشاں یہ نخل
رونق کارگاہِ برگ و نوا
رہِ وراہِ خلد کا توشہ
صاحبِ شاخ و برگ و بابائے آم

غالب اور ذوق کے سہرے

مولوی محمد حسین صاحب آزاد اپنی بے نظیر تصنیف آبِ حیات میں ذیل
کے نظموں کی شانِ نزول یوں ارقام فرماتے ہیں۔

”نواب زینت محل کو بادشاہ (بہادر شاہ دہلی) کے مزاج میں
بہت دخل تھا میرزا جواں نخت اُن کے بیٹے تھے ۴۰ جب ان کی شادی
کا موقع آیا تو بڑی دھوم دھام کے سامان ہوئے میرزا نے سہرا کہہ کر حضور میں
گزرانا۔ مقطع کو سن کر حضور کو خیال ہوا کہ اس میں ہم پر چٹک ہے۔ گویا
اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سہرے کے برابر کوئی سہرا کتنے والا نہیں
ہم نے جو شیخ ابراہیم ذوق کو استاد اور ملک اشعر بنایا ہے یہ سخنِ نفی ہے

بعید ہے بلکہ طرفداری ہے چنانچہ اسی دن اُستاد مرحوم (شیخ ابراہیم قدس) جو حسب معمول حضور میں گئے تو بادشاہ نے وہ سہرا دیا کہ استاد اسے دیکھئے اُنہوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی۔ پیرو مرشد درست۔ بادشاہ نے کہا کہ اُستاد تم بھی ایک سہرا کماد و عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا کہ ابھی لکھ دو اور ذرا قطع پر بھی نظر رکھنا۔ اُستاد مرحوم وہیں بیٹھ گئے اور عرض کیا (ذوق کا سہرا بھی ذیل میں درج ہے)

ارباب انشاط حضور میں ملازم تئیں اُسی وقت اُنہیں ملا شام تک شہر کی گلی گلی کوچہ کوچہ میں پھیل گیا دوسرے ہی دن اخباروں میں شہر ہو گیا مزار بھی بڑے اداسناس اور سخن فہم تھے۔ سمجھے کہ تھکا چڑھ اور ہو گیا کچھ اور۔ یہ قطعہ حضور میں گذرانا۔

میرزا غالب

یاد ہا شہزادہ جوانِ نخت کے سر پر سہرا ہے ترے حُسنِ دلِ فروز کا زیور سہرا
نبھہ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا نمبر سہرا
در نہ کیوں لائے ہنس شقی میں لگا کر سہرا
تب بنا ہو گا اس انداز کا گز بھر سہرا

خوش ہواے نخت کہ ہوا آج ترے سر سہرا
کیا ہی اس چاندتے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر لے طرفِ کلاہ
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی

ہے رگ ابر گہ بار سہرا سہرا
 رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا
 چاہئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا
 گوندھے پھولوں کا بھلا کچھ کوئی نیکو سہرا
 کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ اختر سہرا
 لائے کا تاب گرا بنارے گوہر سہرا

رُخ پہ دولہا کے جو گہمی سے پسینا ٹپکا
 یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قیاسے بڑھ جا
 جی میں اترائیں نہ مونی کہ ہمیں میں ایک چیز
 جبکہ اپنے میں تاویں نہ خوشی کے مارے
 رُخ روشن کی دمک لگو ہر غلطی کی چمک
 تارِ ریشم کا نہیں ہے یہ رگ ابر بہار

ہم سخن فہم میں غالب کے طرفدار نہیں
 دیکھیں اس سہرے کی کہدے کوئی غلط کر سہرا

شیخ محمد ابراہیم - ذوق

آج ہے بین سعادت کا ترے سر سہرا
 کشتے زریں میں مینو کی لگا کر سہرا
 رُخ پُر نور پہ ہے تیرے منور سہرا
 دیکھیں مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا
 گوندھے سورہ اخلاص کو پڑھ کر سہرا
 گائیں مرغانِ نوا بخ نہ کیونکر سہرا

اے جواں بخت مبارک ترے سر پر سہرا
 آج وہ دن ہے کلاے دُرِ نجم سے فلک
 تالیشِ حُسن سے مانند شعاعِ خورشید
 وہم کے صلِ علی یہ کہے سبحان اللہ
 تابنے کھڑے جی میں رہے اخلاصِ رحیم
 دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی

تار بارش سے بنا ایک سرا سر سہرا سریہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا تیرا بنوایا ہے سلسلے کے جو گوہر سہرا اللہ اللہ سرے پھولوں کا معطر سہرا کنگنا ہاتھ میں زریا ہے تو سر پر سہرا کھول دے منہ کو جو تو منہ کو اٹھا کر سہرا دہم نظارہ ترے روے نکو پر سہرا واسطے تیرے تراذوق ثنا کر سہرا	روے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار ایک کو ایک پہ تڑپیں ہے دم آرائش اک گہر بھی نہیں صد کان گہر میں چھوڑا پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادبنا سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بڑھی رونائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک کثرت تار نظر سے ہے تماشائیوں کے دُر خوش آئے بے مضامین سے بنا کر لایا
جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنادے اسکو دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا	
معذرت از میرزا غالب	
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے کچھ شاعری ذریئہ عزت نہیں مجھے ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے	منظور ہے گذارش احوال واقعی سوچت سے ہے پیشہ آبا پس گری آزادہ رو ہوں اور مہسلک ہو صلح کل کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں استادشہ سے ہو مجھے پر خاشاک خیال

جامِ جہاں ناما ہے شہنشاہ کا ضمیر میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا سہرہ لکھا گیا زرہ امتثال امر مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات روئے سخن کسی کے طرف ہو تو رو سیاہ	سو گند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ
کہتا ہوں پتہ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

میر عبیر علی نیس

پیدائش فیض آباد ۱۲۱۷ھ وفات لکھنؤ ۱۲۹۱ھ

میر عبیر علی نیس کا خاندان دلی کا خاندان تھا ان کے پردادا میر ضاحک نے
دلی چھوڑ کر فیض آباد میں سکونت اختیار کی۔ میر حسن صاحب شہسوی بدینہ ان کے
بیٹے تھے جب نواب آصف الدولہ نے فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ کو دارالریاست
قرار دیا تو تعلقات شاہی کی وجہ سے میر ضاحک اور میر حسن کی آمد و رفت لکھنؤ
میں جاری ہوئی اور آخر کار میر حسن کے صاحب زادہ میر خلیق نے شاہی زمانہ
ابجد علی شاہ میں فیض آباد ترک کر کے لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کی۔
میر خلیق اپنے زمانہ کے نامی مرثیہ گو تھے اور انھوں نے اور ان کے ہم عصر

میر ضمیر نے اپنے زمانہ میں مرثیہ کے فن کو بہت ترقی دی۔ اس سے ظاہر ہے کہ میر انیس خاندانی شاعر اور ذاکر تھے چنانچہ ایک موقع پر خود فرماتے ہیں عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں پانچویں لہشت ہے شستیر کی مدامی میں جب میر خلیق بوڑھے ہوئے تو میر انیس نے باپ کی جگہ لی دوسرے طرف سے میر ضمیر کے شاگرد رشید مرزا دبیر ان کے مقابلے کو نکلے۔ اس زمانہ کا لکھنؤ اس فن کی ترقی کے لئے خاص طور سے موزوں تھا اول تو سلطنت اودھ کا شباب تھا دوسرے بڑی بات یہ تھی کہ بادشاہ سے لے کر امرا اور غریب تک شیعہ مذہب رکھتے تھے تیسرے میر ضمیر اور میر خلیق کی طبع آزمائیوں نے اس صنف سخن کو پہلے کے مقابلہ میں بہت بلند اور وسیع کر دیا تھا۔ لوگوں نے ان دونوں بزرگوں کو نقطہ مقابل کر کے تعریفیں شروع کر دیں اور ان سخن آفرینوں کی جدت پسند طبیعتوں نے ایک دوسرے کی چوٹ پر طبع آزمائیاں کر کے اختراع اور ایجاد کے دریا بہا دیئے جب تک لکھنؤ آباد رہا دونوں صفا کبھی باہر نہیں گئے تھے لیکن لکھنؤ کی تباہی کے بعد عظیم آباد۔ حیدر آباد۔ بنار۔ الہ آباد وغیرہ کو ان مقتدر میہمانوں کی میزبانی کا فخر کبھی کبھی حاصل ہوا کرتا تھا۔ ہر جگہ کے سخن شناس دونوں استادوں کو آنکھوں پر بٹھاتے تھے اوجھی کچھ کہ چاہئے قدر دانی کرتے تھے میر صاحب کے مرنے پر مرزا دبیر نیاہ کی۔

طور سینا بے کلیم اللہ میر بے انیس

میرانیس کے کلام کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ مولوی محمد حسین صاحب آزاد صاحب تذکرہ آب حیات میں فرماتے ہیں ”انھوں نے ایجاد و مضمین کے دریا بہا دیے۔ ایک مقلد مضمون کو سیکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا۔ ہر مرثیہ کا چہرہ نیا۔ آمدنی۔ رزم جداء بزم جدا۔ اور ہر سیدان میں مضمون اچھوتا۔ تلوار نی۔ نیزہ نیا۔ گھوڑا نیا۔ انداز نیا۔ مقابلہ نیا۔ اور اس پر کیا منظر ہے ضعیف کا عالم دیکھو تو بجان اللہ۔ رات کی رخصت سیاہی کا پھٹنا۔ نور کا ظہور۔ آفتاب کا طلوع غور۔ سہار شام ہے تو شام غرباں کی اُداسی کبھی رات کا سناٹا کبھی تاروں کی چھاؤں کو چاندنی اور اندھیرے کے ساتھ رنگ کر رنگ دکھایا ہے۔ غرض جس حالت کو لیا ہے اس کا سماں بلند و بڑبڑا جس طرح ان کا کلام الجواب دیکھتے ہو اسی طرح ان کا پڑھنا بھی بے مثال ہی تھا۔ ان کی آواز۔ ان کی قد و قامت۔ ان کی صورت کا انداز غرض ہر شے اس کام کے لئے ٹھیک اور موزوں واقع ہوئی تھی۔ ان کا اور ان کے بھائیوں کا یہی قاعدہ تھا کہ ایک بڑا آئینہ سامنے رکھ کر خلوت میں بیٹھتے تھے اور مرثیہ پڑھنے کی مشق کرتے تھے۔ وقف۔ حرکات۔ سکانات اور بات بات کو دیکھتے تھے اور آپ کی اور اسکی موزونی پر خیال کرتے تھے۔ اسلئے یہ ہے کہ انیس اردو میں ایک ایسا شاعر ہے جس نے غزل کے تنگ میدان سے نکل کر اُردو شاعری کو وسعت دی۔ مناظر قدرت اور

جدبات انسانی کی تصویریں جو انیس نے کھینچی ہیں اُن کا جواب اُردو زبان میں بننا دشوار ہے، انیس کی شاعری میں مصوری کا لطف آتا ہے اس خیال سے انیس اور ٹینیسن کی شاعری میں بہت مشابہت ہے۔ انیس کی زبان میں بھی ایک خاص لطافت ہے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نور کا دریا بہ رہا ہے۔ انیس کے کلام میں شاید ایک بھی دقیق اور غیر فہیم لفظ نہ ملے گا۔ بندش کی چستی، نشست الفاظ کی خوبی، ترکیب کی دلاوری، برجستگی اور سلاست میر صاحب کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ اگر اُردو شاعری کو موجودہ زمانہ میں وسعت دینے کی کوشش کجائے تو انیس کی شاعری کی تقلید سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔

مناجات

یارِ جہن نظم کو گلزارِ ارم کر	اے ابر کرم خشک زراعت پر کرم کر
تو فیض کا مبداء ہے، توجہ کوئی دم کر	گننام کو، اعجازِ بیابانوں میں دم کر
جب تک یہ چمک مہر کی پرتو سے نہ جائے	
قلیم سخن میرے قلم سے نہ جائے	
اس باغ میں چشمِ ہویں ترے فیض کے جاری	ابلیس کی زبان پر جو تری شکر گزاری
بر نخل برومند ہو یا حضرتِ باری	پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضتِ باری
وہ گل ہوں عنایتِ جہن طبعِ نیکو کو	

عالم کو دکھا دے برش سیف الہی لاریب ترے نام پہ ہے سکۂ شاہی	ہو ایک زباں ماہ سے تامل سکین باہی جرأت کا دھنی تو ہے یہ چلاٹیں سپاہی
ہر دم یہ اشارہ ہو دوات اور قلم کا تو مالک و مختار ہے اس طبیل و علم کا	
صبح کی سہار	
ہونے لگا اُفق سے ہو یدر نشان صبح برسو ہوئی بلند صداے اذان صبح	ٹپ کر چکا جو منزلِ شب کا روان صبح گردوں سے کوچ کرنے لگے اختران صبح
پنماں نظر سے روے شب تار ہو گیا عالم تمام مطلع النوار ہو گیا	
در کھل گیا سحر کا ہو اہمند بابِ شب دفتر کشاے صبح نے اُلٹی نقابِ شب	خورشید نے جو رخ سوا اٹھایا نقابِ شب انجم سے فرد فرد سے لے کر حسابِ شب
گردوں پہ رنگ چہرہ متاب فق ہوا سلطانِ غربِ شرق کا نظم و نسق ہوا	
گردوں پہ عالمان سحر کا ہو نصب بس جا بجائے اٹھ گئی انجم کی فوج سب	پہونچا جو تہ مہر سے فرمانِ غزلِ شب نشی آسماں مع دفتر ہوا طلب

تا صبح فرد فرد میں بیگانگی ہوئی برخاست کی چراغوں کو پروانگی ہوئی	
یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے رول آئی بہار پر گلِ منتاب کی خزاں	چُن لے چُن سے پھولوں کو جسطح باغبان مُر جھاکے گر گئے ثمر و شاخ کملشاں
دکھلانے طور بادِ سحر نے سہوم کے پڑمُردہ ہو کے رہ گئے غنچےِ نجوم کے	
چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا فلور وہ رولِ ق اور سرورِ ہوا وہ فضا وہ نور	یادِ خدا میں زمزمہ پر دازئے طیور ننگی جوتیس سے چشمہ کو اور قلب کو مسرور
انساں زمیں پر موملک آسمان پر جاری تھا ذکرِ قدرت حق ہر زبان پر	
وہ سرخِ شفق کی اُدھر چرخ پر بہار شبِ زم کے وہ گلوں پہ گہرے آبِ دار	وہ بارور درخت وہ صحرانہ سبزہ زار پھولوں سے سب بھرا ہوا دامن کو بہار
مانے کھلے ہوئے وہ گلوں کے شمیم کے آتے تھے سردِ سرد وہ جھونکے نیم کے	
پھولا شفق سے چرخ پہ جب لارِ زار صبح کرنے لگا فلک زرا بخیرِ نثار صبح	گلا اڑ شبِ خزاں ہو آئی بہار صبح سُرم گرم ذکرِ حق ہوئے طاعت گزار صبح
تھا چرخِ اخگری پر یہ رنگِ آفتاب کا	

کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا	
چلنا نیم صبح کے جھونکوں کا دمبدم	مرغان باغ کی وہ خوش الحانیان ہم
دہ آب و تاب نہ وہ موجوں کا پھینچ و خم	سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبز ہر ہوا تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا	
وہ پھولنا شفق کا وہ میناے لا جورد	تھل سی وہ گیا وہ گل سبز مرغ و زرد
رکھتی تھی پھونک کہ قدم اپنا ہوائے سرد	یہ خوف تھا کہ دامن گل پر پڑے نہ گرد
دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھا رکھا	
گرمی کی شدت	
دہ نواہ آفتاب کی حدت دہ تاب تاب	کالا تھا رنگن صو پے دن کا مثال شب
خود نہر علقہ کے بھی سوکھے ہونے تھے قلب	نیچے تھے جو جابوں کے پتے تھے سب کسب
نہرخی اوڑھی تھی پھولوں کو سبزی گیاہ سے سایہ کنوئیں میں ترا تھا پانی کی چاہ سے	
آبِ رواں سو منہ نہ اٹھاتے تھے جانور	جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اُدھر اُدھر
مردم تھے سات پردوں کی اندر عرق میں تر	خسنا نہ مڑھ سے نکلتی نہ تھی نظر
اگر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں	

	پڑ جائیں لاکھ آبلے پانے نگاہ میں	
چھینے کو برق چاہتی تھی دامنِ سحاب کا فور صبح ڈھونڈتا پھرتا تھا آفتاب	آئینہ فلک کو نہ تھی تاب و تیب کی تاب سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو مضطرب	
	بھڑکی تھی آگ گبند چرخِ اشیر میں بادل چپے تھے سب کرۂ زمہریر میں	
آہو نہ نہ نکالتے تھے سبزہ زار سے گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے	غیر اٹھتے تھے زخون کے مارے کچھارے آئینہ مہ کا تھا مکدر غبار سے	
	گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر بہن جاتا تھا جو کرتا تھا دانہ زمین پر	
انکار سے تھے حباب تو پانی شہرِ نشانی تہ میں تھے سب ننگ مگر تھی لبوں جاں	گرداب پر تھا شعلہ جوالہ کا گساں مٹے نہ نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں	
	پانی تھا آگ گرمی روز حساب تھی ماہی جو تھ موج تک آئی گلاب تھی	
	گھوڑے کی تعریف	
سا پنچے میں تھے ڈھلے ہونے سبائے کے چوڑ بند نازک مزاج و شوخ و سنیہ شیم و سر بلند	وہ جست و خیز و سرعت و چالاکی سمند نمِ دریا بہتا ہے روشن ہزار چند	

پتلی جدھر سوار نے پھیری وہ مُڑ گیا اُترا وہ برق بن کے پری ہو کے اُڑ گیا	
جرات میں شک شیر تو بیکل میں پلپلتن	پلوی کے وقت کبک درمی جبت میں ہن
بجلی کسی جگہ تو لکھیں ابر قطرہ زن	ہن بن کے آنے جانے میں طاؤس کلپن
سیاب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا	
غصے میں آنکھڑیوں کے اُبانے کو دیکھئے	ہن بن کے جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھئے
ساپے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھئے	تھم کر کنوٹیوں کے بدلنے کو دیکھئے
وہ تھو تھنی کہ عنچہ سوسن سے تنگ تر وہ آنکھڑیاں نخل ہوں ہرن جھکدیکھکر	
شمشیر آبدار	
بے پاؤں جدھر ہاتھ جپاتی ہوئی آئی	ندھی اُدھراک خوں کی اُبلتی ہوئی آئی
دم بھر میں وہ سورنگ بدلتی ہوئی آئی	پنی پی کے لہو لعل اُگلتی ہوئی آئی
بیرا تھا بدن رنگ زمر دے برا تھا جو ہر جو کو پیٹ جو اہرے بھرا تھا	
زیبا تھا دم جنگ پر یوش اُسے کہنا	معشوق بنی سُرخ لباس لے جو پہنا

اس اوج پہ وہ سر کو جھکائے ہوئے رہنا	جو ہر تھکے کہ پینے تھی دوسن پھولوں کا گھنا
سیب چمن خلد کی بوباس تھی پھل میں رہتی تھی وہ شیر سے دوٹھاکے بغل میں	
پونجی جو سپر تک تو کلائی کو نہ چھوڑا	ہر باتھ میں ثابت کسی گمانی کو نہ چھوڑا
شوخی کو شرارت کو لڑائی کو نہ چھوڑا	تیزی کو رکھائی کو غمانی کو نہ چھوڑا
اعضائے بدن قطع ہوئے جاتے تھے سب قینچی سی زباں چلتی تھی فتنے تھے غضب کے	
تلوار کا کاٹ	
بجلی گری کہ فون پہ تیغ دو سر گری	کٹ کر کسی کی تیغ کسی کی سپر گری
چمکی کبھی فلک پہ کبھی فرق پر گری	سر کاٹ کر ادھر سے جو اٹھی ادھر گری
رز میں تنوں میں مثل کفن چاک ہو گئیں اک آن میں صفیں کی صفیں خال ہو گئیں	
غل تھا کہ وہ چمکتی ہوئی آئی یہ گری	بر چھپی سے اڑ گئی وہ سناں یہ گرہ گری
ترکش کٹا کمان کیانی سے زہ گری	یہ سر اڑا، وہ خود اڑا یہ زہ گری
آتی ہے لشکروں پہ تباہی اسی طرح گرتی ہے برق قہر الہی اسی طرح	

کیا کیا چمک دکھاتی تھی سرکٹ کاٹ کے پانی وہ خود پئے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے	منی تھی بس تمنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے
کیا جائے ملا تھا مزا کیا زبان کو کھا جاتی تھی بہا کی طرح استخوان کو	
ہر بات میں اڑا کے کلانی نکل گئی کاٹی زرہ دکھا کے صفائی نکل گئی	کوندی، گرمی، زمیں میں سمائی نکل گئی مچھلی تھی اک کہ دام میں آئی نکل گئی
چار آئینہ کے پار تھی اس آب تاب سے جس طرح برق گر کے نکل جائے آب سے	
مسافرت	
ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفینیں سوشنل ہوں پر دھیان لگا رہتا ہوں گھیریں	راحت نہیں ملتی کوئی دم آٹھ پہر میں پھرتی ہے سدا شکل عزیزوں کی نظیریں
سنگِ غم فرقت دل نازک پہ گراں ہے اندوہ غریب لوطنی کا ہش جاں ہے	
گوراء میں ہمراہ بھی ہو راحلہ و زاد جب عالم تمنائی میں آتا ہے وطن یاد	جاتی نہیں افسردگی خاطر ناشاد ہر گام پہ دل منسل جبرئیں کرتا ہے فریاد
اک آن غم درج سے فرصت نہیں ہوتی	

	منزل پر بھی آرام کی صورت نہیں ہوتی	
منزل پہ کمر کھول کے سوتے ہیں مسافر شب جاگتے ہی جاگتے ہو جاتی ہو آخر		ہمراہ سفر میں ہوں اگر حامی و ناصر جب ہو سفر خوف و پریشانے خاطر
	ہر طرح مسافر کے لئے رنج و تعب ہے رہ جائے پس قافلہ تھک کر تو غضب ہے	
منزل پہ پہونچنے کے بھی پڑ جاتے ہیں لالے ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائیں کہیں قافلہ والے		دکھ دیتے ہیں ایک ایک قدم پاؤں سچالے ہاتھوں سے اگر مٹیہ کے کانٹوں کو نکالنے
	والمندوں کے لئے کو بھی آمانیں کوئی تھک کر بھی جو بیٹھے تو اٹھا آمانیں کوئی	
عجز و انکسار		
جو جس میں تکبر غنن ایسا نہیں اچھا آپ اپنی ثنا واہ یہ شیوہ نہیں اچھا		خاموش زبان عوسے بجا نہیں اچھا بس بس یہ غور اور یہ دعویٰ نہیں اچھا
	کم مایہ کمال اپنا جتا دیتا ہے اکثر جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے اکثر	
پھولوں پہ کوئی عطر اگانے تو ہی بیکار		نور شید کو کچھ حاجت زیور نہیں نہما

خود مشک ہو خوشبو زک خوشبو کے عطار	اعلیٰ ہے اگر جنس تو کیا حاجت انہار
چھینے کی نہیں آپ اگر عود میں بو ہے	جو بد ہے سو بد ہے جو نیکو ہے سو نیکو ہے
خارج ہے اصالت سے وہ سی نیچ جی سیف	انساں کے لئے عجز ہی لازم ہے ہر کیف گر صاحب جو ہر نہ چلے ٹھک کے تو صد حیف
ہوتا نہ فروتن تو کبھی نام نہ ہوتا	آفاق میں یوں فینٹ نکلیں عام نہ ہوتا
اولاد	
نکمت کوئی بوسے گل ترے نہیں بہتر	دولت کوئی دنیا میں پسیر سے نہیں بہتر
ریحان ہے لہری رُوح ہی روح ہی ہے	صدموں میں علانِ دل مجروح ہی ہے
آبادی کا نشانہ انساں ہے اسی سے	ہاں باپ کا دل غنچہ خنداں اسی سے
گھر قبر سے بد تر ہے جو فرزند نہیں ہے	کس طرح کھلے دل کہ جگر بند نہیں ہے

یہ وہ ہے عصا پر جو اُٹھتا ہے جس سے	یہ وہ ہے نگیس نام و نشان ہوتا جس سے
وہ شمع ہے پُر نور کماں رہتا ہے جس سے	وہ در ہے قوی رشتہ جاں ہوتا جس سے
کھوتے نہیں یہ مال زر و مال کے بٹلے	سوئی بھی لٹا دیتے ہیں اس لال کے بٹلے
صورت یہی شوکتِ نبی اِجلا ہے	ثروت یہی حشمتِ یہی اقبال ہے
سرِ پایہ یہی نقدِ یہی مال ہے	گوہرِ یہی یا قوتِ یہی لعل ہے
دلِ بند ہو پہلو میں تو غم پاس نہیں ہے	کچھ پاس نہیں گر یہ رقم پاس نہیں ہے
ماں باپ کی آسائش و راحت ہے پس	آطمیٰ میں بھی عینے کی حلاوت ہے پس
خوابِ جسم میں آنکھوں میں بھٹا رہے پس	ایامِ ضعیفی میں بھی طاقت ہے پس
آرامِ جگر قوتِ دلِ راحتِ جاں ہے	پیری میں یہ طاقت ہے کہ فرزندِ جاں ہے
وہ فتنے ہے خوشی در پہ کھڑی رہتی ہے جس سے	وہ چین ہے راحت کی گھڑی رہتی ہے جس سے
وہ لعل ہے امید بڑی رہتی ہے جس سے	وہ در ہے یہ درِ جاں لڑی رہتی ہے جس سے
آرامِ جگر تاب و توان ساتھ ہو اس کے	پھر تا ہے جدھر رشتہ جاں ساتھ ہو اس کے
مالک سے بھرے گھر کے اُجڑ جانے کو چھو	گھر والوں سے اس تفرقہ پڑ جانے کو چھو

ماں باپ سے قسمت بگڑ جانے کو پوچھو	یعقوبؑ یوسف کے پچھڑ جانے کو پوچھو
	اللہ دکھائے زالم نور نظر کا بہ جانا ہے آنکھوں سے لہو قلب جگر کا
رُباعیات	
آغوشِ لحد میں جبکہ سونا ہوگا تنائی میں آہ کون ہو دے گا انیس	جز خاک نہ تکیہ نہ پچھونا ہوگا ہم ہو دیں گے اور قبر کا کونا ہوگا
دُنیا بھی عجب سراے فانی دیکھی جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا	سب چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہوگا جو کچھ کہ ہوا ہو اکرم سے تیرے
جوتے ہے فنا اُسے بقا سمجھا ہے غافل اس زندگی کو کیا سمجھا ہے نادران تجھے فکر آب و دانے کی ہے	یہ چیز ہے کم اُسے سوا سمجھا ہے غافل اس زندگی کو کیا سمجھا ہے اب گرم خبر موت کے آنے کی ہے

ہستی کے لئے ضرور اک دن ہے فنا	آنا تیسری دلیل جانے کی ہے
رتبہ جسے ^{دیتا ہے} مہلت میں خدا دیتا ہے	وہ دل میں فرقہ کی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تھی مغز ثنا آپ اپنی	جو ظن کہ خالی ہے صدا دیتا ہے
گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دکھوں	یا معدن و کوہ و دشت دریا دکھوں
برج تری قدرت کے ہیں لکھوں جگہ	حیراں ہو کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دکھوں
ماں باپ سے بھی سوا بہ شفقت تیری	افزوں بہ تیرے غضب رحمت تیری
جنت انعام کر کہ دوزخ سے جلا	وہ رحم ترا ہے یہ عدالت تیسری
نہیں عبادت عبادت تیری	خلق و کرم و عطا بہ عادت تیری
صحرا صحرا ہیں گو کہ غصیاں میرے	دریا دریا مگر ہے رحمت تیسری
کیا کیا دنیا سے صاحب مال گئے	دولت نہ گئی ساتھ نہ المفاہل گئے
پہونچا کے ملک پہ آئے سب گئے	ہمراہ اگر گئے تو ائصال گئے

آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہو تو اللہ اللہ کس قدر دُور ہے تو	پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو نزدیک رکھاں سے ہے اس پر یُعبَد
نیوَب نہ ہوں شاہِ گدا کے آگے یہ ہاتھ جب اٹھیں تو خدا کے آگے	عزت رہے یار و آشنا کے آگے یہ پانوں چلیں تو راہِ مولا میں انیس
بہل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے جس پہول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے	گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے بر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
————— ❦ —————	

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی

پیدائش پانی پت ۱۸۳۷ء

خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کا سلسلہ خاندانی حضرت عبداللہ انصاری سے ملتا ہے آپ کے والد کا نام ایزد بخش تھا مولد پانی پت ہے مگر نوجوانی ہی میں دہلی آ گئے۔ نواب مصطفیٰ خاں صاحب رئیس جہانگیر آباد اس زمانہ میں بڑے عالم اور قدردان رئیس تھے جاگیر اگرچہ جہان آباد میں تھی مگر رہتے دہلی میں تھے مولانا حالی ان کے نزدیک کی تعلیم پر مامور ہوئے اردو فارسی میں میرزا غالب کی شاگردی سے فیض حاصل کیا جب قدیم سرپرست راہی عالم بقا ہونے اور میرزا غالب سے بھی دنیا خالی ہوئی تو خواجہ صاحب اول دہلی کے ایٹکلو عربی اسکول میں فارسی کی مدرس پر مامور ہوئے اور اس کے بعد رالے بہادر ماٹھ پیار سے ڈال صاحب کی سفارش سے لاہور کے تعلیمی بینک ڈپو میں کام کرنے لگے۔ وہاں ان کا مولوی محمد حسین آزاد کا ساتھ ہوا اور آزاد کی تقلید میں مولانا مودع نے نیچول شاعری کی طرف توجہ کی جب بینک ڈپو ٹوٹا تو حالی پھر دہلی میں اپنی پہلی جگہ پر آئے اور یہیں انہوں نے سندس مدد جزا سلام لکھا اس سندس کی بہت قدر ہوئی۔ اس کے بعد حیدر آباد سے ان کا وظیفہ مقرر ہو گیا جو اب تک ملتا ہے۔ ۱۹۰۷ء میں سرکار انگریزی کی طرف سے شمس العلماء کا

خطاب ملا۔ اس وقت مولانا حالی پانی پت میں خاندانین ہیں یادگار غالب
حیات سعدی اور حیات جاوید مولانا کی مشہور کتابیں ہیں اور اردو کے نشر کے ذریعہ
میں یہ تصانیف یادگار ہیں۔

مولانا حالی کے کلام نظم کے متعلق ارباب نظر میں اختلاف ہے جو حضرات
محض پاکیزگی خیالات کو شاعری کا جوہر کہتے ہیں بلا لحاظ اس امر کے کہ ان خیالات
کو کس پیرایہ میں ادا کیا گیا ہے وہ مولانا موصوف کو نئی شاعری کا پیہر سمجھے ہیں
اور امر واقعی یہی ہے کہ جس قدر نئے خیالات آپ نے نظم کئے ہیں کسی دوسرے
شخص نے نظم نہ کئے ہوں گے لیکن جن نقادان سخن کی یہ رائے ہے کہ شاعری
کا پہلا اصول یہ ہے کہ نشر سے زیادہ پُر تاخیر و دلکش ہو اور محض خیالات
کی پاکیزگی ارکان شاعری میں نہیں ہے بلکہ خیالات کے پُر تاخیر اور لطیف
پیرایہ میں نظم ہونے کو شاعری کہتے ہیں وہ مولانا ممدوح کے کلام کی
داد دینے میں تامل کرتے ہیں۔ وہ مولانا حالی کے حبیب قوم اور عالی خیال
بزرگ ہونے کے مزور مقرر ہیں مگر شاعر ادبیت سے مولانا موصوف کے
کلام کے قائل نہیں۔

مرثیہ جناب مرزا اسد اللہ خاں حوم دہلوی مختصراً غالب

وقت کو تاہ قصہ طولانی

کیا کہوں حال درو پنبانی

دیکھ کر رنگِ عالمِ فانی گوشہٴ فقر و بزمِ سلطانی مانجِ فغفور و تختِ خسائی جامِ تہشید و رانِ ریسائی حرمِ باطل ہے عقلِ یونانی اک تماشا ہے حسنِ کُنائی پیشہٴ خضر کا بوگر پانی اگر کُٹ خساتمِ سلیمانی	عیشِ دنیا سے ہو گیا دلِ سرد کچھ نہیں جز طاسمِ خواب و خیال ہے سرا سرِ فریب و ہم و گماں بے حقیقت ہے نکل موجِ سرباب لفظِ مہمل ہے نطقِ اسرائیلی ایک دو بوکا ہے لہجہٴ داؤدی مذکور و آشگی میں تر لبِ خشک لوں نہ اک نشتِ خاک کے بدلے	
بحرِ ہستی بحرِ سراب نہیں چشمہٴ زندگی میں آب نہیں		
اس سے آخر کو کجِ ادائی کی تونے کی جس سے یو فائی کی ہاں قسم مجھ کو آشنائی کی صلح میں چاشنیِ لڑائی کی جس کو طاقت نہ ہو جدائی کی جس کو عسادت نہ ہو گدائی کی شان ہو جس میں دلِ ربانی کی	جس سے دنیا نے آشنائی کی تجھ پہ پھولے کوئی عبتِ اس عمر ہے زمانہٴ دُفسا سے بیگانہ یہ وہ بے نمر ہے کہ ہے اس کی ہے یہاں حظِ وصل سے محروم ہے یہاں حفظِ وضع سے مایوس خندہٴ گل سے بے بقا تر ہے	

	خوبیاں جس میں ہوں خدائی کی آج خاقانی و سنائی کی	جس کا سد سے نار و اتر ہے بات بگڑی رہی سہی افسوس	
	رشتہ عفی و فخر طالب مُرد اسد اللہ خان غالب مُرد		
	جس کی تھی بات بات میں اک با پاک دل پاک ذات پاک صفات رُند اور مزاج کرام و ثقات سو تکلف اور اس کی سیدھی بات دن کو کتنا دن اور رات کو رات قلم اُس کا تھا اور اس کی ہاتھ لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات خواجہ نوشتہ تھا اور شہزاد یہاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات	بائبل بند مگر کیا بیہاست نکتہ وال نکتہ بیچ نکتہ شناس شیخ اور بدلتہ شیخ شوخ مزاج لاکھ مضمون اور اسکا ایک شٹھول دل میں چپتا تھا وہ اگر بے شل ہو گیا نقش دل یہ جو لکھا تھیں تو دلی میں سکی باتیں تھیں اس کے مرنے سے مگر گئی دلی یہاں اگر بزم تھی تو اسکی بزم	
	ایک روشن دماغ تھا نہ رہا شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا		
	کس کی باتوں سے دل پہ لائیں کس سے دادِ سنخو رسی پائیں	دلی باتیں جب اس کی یاد آئیں کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل	

مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب پست مضمون ہے نوٹ اُستاد لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو اس کو انگلوں پکیوں دیں تہ تیغ قدسی و صائب و اسیر و کلیم ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے	کس سے اصلاح لیں کہ مھر جائیں کس طرح آسمان پہ پہونچائیں اہل بیت جنازہ ٹھہرائیں سوے مدفن ابھی نہ لے جائیں اہل انصاف غور فرمائیں لوگ جو چاہیں اُن کو ٹھہرائیں ہے ادب شہِ طمانہ نہ کھلوائیں

غالب نکتہ والے کیا مطلب
خاک کو آسمان سے کیا نسبت

نثر حسن و جمال کی صورت تہنیت اک نشاط کی تصویر قال اس کا وہ آئینہ جس میں اس کی توجیہ سے پکڑتی تھی اس کی تاویں سے بدلتی تھی لطف آغاز سے دکھاتا تھا چشمِ دوراں سے آج چھپتی ہے لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے	نظم غنچ و دلال کی صورت تعزیت اک طلال کی صورت نظر آتی تھی حال کی صورت شکلِ امکاں محال کی صورت رنگِ بجاں وصال کی صورت سخن اس کا مال کی صورت انوری و کمال کی صورت علم و فضل و کمال کی صورت

غالب بے مثال کی صورت	دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے
	اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ کیسے ڈھونڈھے نہ پائیں گے یہ لوگ
اپنا بیگانہ انکسار ہے آج رحلتِ خسرو روزگار ہے آج ترخصتِ موسم بہار ہے آج دوشِ احباب پر سوار ہے آج اس کی چپ سے جگر نکال رہا آج دبی بر بھی جگر کے پار ہے آج ماتم یا غمگن رہا آج جان شیریں بھی ناگوار ہے آج ہمہ تن چشمِ انتظار ہے آج	شہر میں جو ہے سو گوار ہے آج نازشِ خلق کا محل نہ رہا تھا زمانہ میں ایک رنگیں طبع بارِ احباب جو اٹھاتا تھا تھی ہر ایک بات نیشتر جس کی دل میں مدتِ سو تھی خلشِ حب کی دل مضطر کو کون دے تسکین تلخے غم کہیں نہیں جاتی کس کو لاتے ہیں بہر دفن کہ قبر
	غم سے بھرتا نہیں دل ناشاد کس سے خالی ہوا جہاں آباد
خوانِ مضمون کا میزبان رہا اب کچھ اندیشہ خزاں نہ رہا کوئی سالار کارواں نہ رہا	نقدِ معنی کا گنجِ دہاں نہ رہا ساتھ اس کے گئی بہارِ سخن ہوا ایک ایک کارواں سالار

گرم بازار گلرخساں نہ رہا قیس و فرہاد کا نشان نہ رہا گل و بلبل کا تر جہاں نہ رہا ریشک شیراز و اصفہاں نہ رہا بادشاہوں کا مدح خواں نہ رہا وہ زمیں اور وہ آسمان نہ رہا	رونقِ حُسن تھی، بسیاں اس کا عشق کا نام اس سے روشن تھا ہو چکیں حُسنِ عشق کی باتیں اہلِ بنداب کر دیں گے کس پرناز زندہ کیونکر رہے گا نامِ ملوک کوئی ویسا نظر نہیں آتا
اُٹھ گیا۔ تھا جو مایہ دار سخن کس کو ٹھہرائیں اب۔ دار سخن	
اک زمانہ کہ سازگار نہ تھا پر کوئی اس کا حق گزار نہ تھا سخن اس کا کسی پر بار نہ تھا درِ خورِ ہمت امتدار نہ تھا جان دینے پر اختیار نہ تھا سر بلندوں سے احساں نہ تھا دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا زہد اس کا مگر شہسار نہ تھا ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا	کیا ہے جس میں وہ مددگار نہ تھا شاعری کا کیا حق اس نے ادا بے صلہ مدح و شعر بے تحسین نذر سائل تھی جان تک لیکن ملک و دولت سے بہرہ ور نہ ہوا خاکساروں سے خاکساری تھی لب پہ احباب سے جھی تھانہ کلا بے ریائی تھی زہد کے بدلے ایسے پیدا کہاں ہیں ست خراب

	منظرِ شانِ حسنِ فطرت تھا معنی لفظ آدمیت تھا	
آج بلبلس نہیں گلستاں میں ایک یوسف نہیں کچھیاں میں اک فلاطوں نہیں جویاں میں ڈھونڈتے کیا ہوسیبِ زماں میں کیا دھڑاے عقیقِ مرجاں میں گوشِ گلِ واہے کیوں گلستاں میں مُرخ کیوں نعرہ زن ہوئیاں میں شیعِ جلتی ہے کیوں شبتاں میں سرمہ بنتا ہے کیوں صفاباں میں	کچھ نہیں فرق باغ و زنداں میں شہرِ سارا بنا ہے بیتِ حزن ملک اکثر ہوا ہے بے آئیں ختمِ حقیٰ اک زباں پر شیرینی حصرتی ک بیاں میں رنگینی لبِ جاد و بیاں ہوا خاموش گوشِ معنی شنو ہوا بے کار وہ گیا جس سے بزمِ روشن تھی نرہا جس سے تھا فردغِ نظر	
	ماہِ کامل میں آگئی ظلمت آبِ حیاں پہ چھا گئی ظلمت	
سگہ اپنا بٹھائے گا آبِ کون ان پر ایمان لائے گا آبِ کون اُس کو دل سے بھلا گا آبِ کون وہ جگہ دل میں پائیگا آبِ کون	بند میں نام پائے گا آبِ کون ہم نے جانی ہے اس قدر سلف اس نے سب کو بھلا دیا دل سے تھی کسی کی نہ جس میں گنجائش	

جا کے دلی سے آئے گا اب کون شعر ہم کو سنائے گا اب کون ہم کو گھر سے بلائے گا اب کون ہم کو چالیں بتائے گا اب کون غزل اس کی بنائے گا اب کون	اُس سے ملنے کو یہاں تم آؤ تھے مر گیا قدر دان فہم سخن مر گیا تشنہ مذاق کلام تھا بساط سخن میں نشاطِ ایک شعر میں ناتمام ہے حسالی	
	کم لٹافیہ من بگی و غویل و غتاب مع الزمان طویل	
چپ کی داد		
اے ماؤ بہنو بیٹیو! دنیا کی زینت تم سے ہے ملکوں کی بستی ہو تمہیں قوموں کی عزت تم سے ہے تم گھر کی ہوشنرا دیاں۔ شہروں کی بوا بیاں غملیں دلوں کی شادیاں دکھ سلکھ میں راحت تم سے ہے تم ہو تو غربت ہے وطن تم بن ہے ویرانہ چین ہو دیں یا پردیس جینے کی حلاوت تم سے ہے پیش کی تم تصویر ہو عفت کی تم تدبیر ہو		

ہو دین کی تم پاساں ایماں سلامت تم سے ہے
 فطرت تمہاری ہے حیا طینت میں ہے مہر و وفا
 گھٹی میں ہے صبر و رضا۔ انساں عبارت تم سے ہے
 مردوں میں ست والے تھے جو ست بیٹھے اپنا کلب کا کھو
 دنیا میں اسے ستونیت و بالے دے کے اب ست تم سے ہے
 مونس ہو خاوندوں کی تم غمخوار فرزندوں کی تم
 تم بن ہے گھر ویران سب گھر بھر میں برکت تم سے ہے
 تم آس ہو بیمار کی۔ تو ہمارے ہو تم بے کار کی
 دولت ہو تم نادار کی عشرت میں عشرت تم سے ہے
 آتی ہو اکثر بے طلب۔ دُنیا میں جب آتی ہو تم
 پر موبنی سے اپنی یہاں گھر بھر چھاجاتی ہو تم

میکے میں سارے گھر کی تمہیں۔ گو مالک و مختار تم
 پر سارے کہنے کی رہیں بیچپن سے خد متکار تم
 ماں باپ کے حکموں پر تیلی کی طرح پھرتی رہیں
 غمخوار باپوں کی رہیں۔ ماؤں کی تابعدار تم
 دن کجمر چکاناریت۔ معنا سینا پر و نانا نکلتا

بیٹھیں نہ گھر پر باپ کے۔ خالی کبھی زہنا تم
 راتوں کو چھوٹے بھائی بہنوں کی خبر اٹھ اٹھ کے لی
 بچہ کوئی سوتے میں رویا اور بوئیں بیدار تم
 سسرال میں پونچیں تو وہاں ایک دوسرا دیکھا جہاں
 جاتریں گویا دیس سے۔ پردیس میں اکبار۔ تم
 وہاں فکر تھی ہر دم یہی۔ ناخوش نہ ہو تم سے کوئی
 اپنے سے رنجش کے کبھی۔ پاؤ نہ وہاں آثار تم
 بدلے نہ شوہر کی نظر۔ سسرے کا دل میل نہ ہو
 آنکھوں میں ساس اور نند کی۔ کھٹک نہ مثل خار تم
 پالاجروں سے گر پڑے۔ بدخوہوں سب چھوٹے
 چتون پہ میل آنے نہ دو۔ گودل میں ہو سیزار تم
 غم کو غلط کرتی رہو۔ سسرال میں ہنس بول کر
 شربت کے گھونٹوں کی طرح پیتی رہو خون جسگر
 شادی کے بعد ایک ایک کو۔ تھنی آرزو اولاد کی
 تم پھنس گئیں جنجال میں۔ خالق نے جب اولاد دی
 دردوں کے دکھ تم نے سے جا پے کی جہیلیں نختیاں
 جب موت کا چٹکھا مزا۔ تب تم کو یہ دولت ملی

میکے میں اور سسرال میں۔ سب کے بوڑل باغ باغ
 گھر میں اُجالا تو ہوا۔ پر تم پہ ہسپتا پڑ گئی
 کھانا پینا اڑھنا اپنا گئیں سب بھول تم
 بچوں کے دھندے میں تمہیں۔ اپنی نہ کچھ سدھ بُدھ ہی
 تب تک بھی سمجھو غیر تھی۔ جب تک بھلے چنگے تھے سب
 پر سا منا آفت کا تھا۔ گر ہو گیا ماندہ کوئی
 سولی پہ دن کٹنے لگے۔ راتوں کی منیدیں اڑ گئیں
 اک اک برس کی ہو گئی۔ ایک ایک پل اک اک گھڑی
 بچوں کی سیوا میں تمہیں گزرے ہیں جیسے دس برس
 قد را سکی جانے گا وہی۔ دم پر ہو یوں جس کے بنی
 کی ہے مہم جو تم نے سر۔ مردوں کو اس کی کیا خبر
 جانے پرانی پیرہ جس کی بوائی ہو پھٹی
 بچا پالنا اولاد کا مردوں کے بوتے سے سوا
 آخر یہ اسے دکھیا ریو! خدمت تمہارے سر پڑی
 پیدا اگر ہو تیں نہ تم بیڑا نہ ہوتا پار یہ
 وجہ آٹھتے دو دن میں۔ اگر مردوں پر پڑا بار یہ

بیستیں خبر اولاد کی۔ مانیں نہ گر بھٹپن میں یہاں
 خالی کبھی کانسل سے آدم کے ہو جاتا جہاں
 یہ گوشت کا ایک لوتھڑا۔ پروان چڑھتا کس طرح
 چھاتی سے پٹائے نہ ہر دم رکھتی گر بچے کو ماں
 وہ دین اور دنیا کے مصلع جن کے وعظ اور پسند
 ظلمت میں باطل کی ہو اُن دنیا میں نور حق میاں
 وہ علم اور حکمت کے بانی جن کی تحقیقات سے
 ظاہر ہوئے عالم میں اسرار زمین و آسمان
 وہ شاہ کشور گزرا اسکندر کہ جس کی دھاک سے
 تھے بید کے مانند لرزاں تاج داران جہاں
 وہ فخر شاہانِ عجم کہ جس کے عدل کی
 مشرق سے تا مغرب زبانون پر ہے جاری دہاں
 کیا پھول چل یہ سب اُنھیں کہ دورِ پودوں کے نہ تھے؟
 سینچا تھا ماٹوں نے جنھیں خون جگر سے اپنے یہاں
 کیا صوفیان با صفا کیا عارفان با خدا
 کیا انبیاء کیا اولیا کیا غوث کیا قطب زماں
 یہ کار سے مالک کی بنتے پاک بندے ہیں بڑے

وہ ماؤں کی گودوں کے زینے سے ہیں سب اوپر چڑھے
 افسوس دُنیا میں بہت تم پر ہوئے جور و جفا
 حق تلفیاں تم نے سہیں بے مہر یاں جھیلیں سدا
 اکثر تمہارے قتل پر قوموں نے باندھی ہے کمر
 دیں تاکہ تم کو یک قلم - خود لوحِ ہستی سے مٹا
 گاڑی گئیں تم مدتوں - مٹی میں جیتی جا گئی
 حامی تمہارا تھانا یاد کوئی جز ذاتِ خدا
 زندہ سدا جلتی رہیں - تم مدہ خاندوں کے ساتھ
 اور چین سے عالم رہا یہ سب تماشے دیکھتا
 بیابا ہی گئیں اس وقت تم جب بیاہ سے واقف نہ تھی
 جو عمر بھر کا عہد تھا وہ کچے دھاگے سے بندھا
 بیابا تمہیں ماں باپ نے اے بے زبانونِ سطح
 جیسے کسی تقصیر پر مجرم کو دیتے ہیں سدا
 گذری امید و بیم میں جب تک رہا باقی سُناگ
 بیوہ ہوئیں تو عمر بھر پھر چین قسمت میں نہ تھا
 تم سخت سے سخت امتحاں دیتی رہیں پر رائیگاں
 کیس تم نے جانیں تک فدا کلائیں لیکن بے وفا

گو صبر کا اپنے نہ کچھ تم کو ملا انعام یہاں
 پر جو فرشتہ نہ ہو وہ گر گئیں تم کام یہاں

کی تم نے اس دارِ محن میں جس محل سے گذر

زیبا بے گر کئے تمہیں فخر بنی نوبہ بشر
 جو سنگ دل سفاک پیاسے تھے تمہارے خون کے

اُن کی تو ہیں بے رحمیاں مشہور عالم میں مگر
 تم نے تو چین اپنے خریداروں بھی پایا نہ کچھ

شوہر ہوں اس میں یا پدر یا ہوں برادر یا پسر
 الفت تمہاری اگر گئی گھر دل میں جس بے دید کے

وہ بدگماں تم سے رہا ہے بے نصیب و اعمر بھر
 گو نیک و داکتر تمہارے نام کے عاشق رہے

پر نیک ہوں یا بد رہے سب تغلق اس واسے پر
 جب تک جو تم علم و دانش سے رہو غرور و مہیاں

آئی ہو جیسی بے خبر و ایسی ہی جاؤ بے خبر
 تم اس طرح بھول اور گم نام دنیا میں رہو

ہو تم کو دنیا کی نہ دنیا کو تمہاری ہو خبر
 جو علم مددوں کے لئے سمجھا گیا آبِ حیات

نہمہ راتھمارے حق میں دوزبر بلابل سر بسر
 آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب
 دُنیا کو دینا ہو گا ان حق تلفیوں کا وہاں جواب

گذرے تھے جگ تم پر کہ بہر دی نہ تھی تم سے کہیں
 تھنا منور تم سے فلک برگشتہ تھی تم سے زمیں
 دُنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھو سب
 تم پر مبادا علم کی پڑ جائے پرچھٹائیں کہیں
 ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہت باقی نہ فرق
 تعلیم پا کر آدمی بن سنا تمہیں زریبا نہیں
 یہاں تک تمہاری جوج کے گائے گئے دُنیا میں لگ
 تم کو بھی دُنیا کی گھن کا آگیا آخر یہ یقیں
 علم و ہنرست رفتہ رفتہ ہو گئیں مایوس تم
 سمجھا لیا دل کو کہ ہم خود علم کے قسابل نہ تھیں
 جو ذلتیں لازم ہیں دُنیا میں جہالت کے لئے
 وہ ذلتیں سب انفس پر اپنے گوارا تم نے کیں
 سمجھا نہ تم کو ایک دن مردوں نے قابل بات کیے

تم بیویاں کھلاٹیں لیکن لونڈیاں بن کر رہیں
 آخر تمہاری چپ دلوں میں اہل دل کے چبکٹی
 بیچہ کہ چپ کی داد آخر بے ملے رہتی نہیں
 بارے زمانہ نیند کے ماتوں کو لایا ہوش میں
 آیا تمہارے صبر پر دریاے رحمت جوش میں

نوبت تمہاری حق رسی کی بعد مدت آئی ہے
 انصاف نے دھندلی سی ایک اپنی جھلک دکھلائی ہے
 گو ہے تمہارے حایموں کو مشکلوں کا سامنا
 پر حل ہر اک مشکل یوں ہی دُنیا میں ہوتی آئی ہے
 اٹکے ہیں روڑے چلتی گاڑی میں سچائی کے سدا
 پر فتح جب پائی۔ سچائی ہی نے آخر پائی ہے

ڈاکٹر محمد اقبال

پیدائش سیالکوٹ ۱۸۹۹ء

ڈاکٹر محمد اقبال ۱۸۹۹ء میں برہم پور سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ اپنے قصبہ کے اسکول کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پا کر ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ کچھ روز اسی کالج میں اسٹنٹ پروفیسر رہے بعد ازاں انگلستان تشریف لے گئے وہاں سے بیرسٹر اور فلسفہ کے ڈاکٹر ہو کر آنے والی سیالکوٹ کے بعد بھی کچھ دنوں گورنمنٹ کالج میں پروفیسر رہے اب صرہ بیرسٹری کرتے ہیں اور لاہور کے مسلمان کشیوں کی انجمن کے سکریٹری ہیں۔ شاعری کا شوق ابتدا سے تھا سب سے پہلے ۱۸۹۹ء میں لاہور کی انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ پر ایک نظم نالہ یتیم پڑھی جس میں مسلمان یتیم بچوں کی مدد کے لئے اپیل کی گئی تھی انجمن حمایت اسلام یا اسلامی جلسوں کے سوا معمولی مشاعروں میں نظم نہیں پڑھتے۔ ابتدا میں چند غزلیں مرزا ارشد گورگانی دہلوی کو دکھائی تھیں اور کسی وقت داغ مرحوم سے بذریعہ خط و کتابت تلمذ اختیار کیا تھا فارسی کے شاعر نہیں مگر عالم ضرور ہیں اور جب کبھی شاذ و نادر فارسی کہتے ہیں تو اچھی کہتے ہیں۔ پروفیسر اقبال آج کل کے ان چند شاعروں میں ہیں جو اردو میں یورپ کے نئے خیالات کا میابی کے ساتھ ظاہر کر سکتے ہیں یعنی جو خیالات

جدید کو اپنے مضامین میں تو مزور جگہ دیتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ اردو شاعری کے آئین اور اردو زبان کی پاکیزگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ آپ کے کلام کی تخصیص یہ ہے کہ شاعرانہ لطافت کے ساتھ فلسفیانہ مضامین کی بھی جھلک نظر آتی ہے۔ پنجاب کو آپ کی ذات پر فخر ہے۔ آپ کی نظیں اکثر لاہور کے مشہور رسالہ نغز میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ذیل کا اقتباس اسی رسالہ کے مختلف نمبروں سے کیا گیا ہے۔

ہمارا دلیں

ہم بلبلیں ہیں اُسکی یہ گلستاں ہمارا سمجھو دین ہیں بھی دل ہو جہاں ہمارا وہ سنتے ہی ہمارا وہ پاساں ہمارا نکاش ہے جن کے دم سے رشک جنساں ہمارا اُتر اترے کنارے جب کارواں ہمارا بندی میں ہم وطن ہو بند و ستاں ہمارا اب تک مگر ہے باقی نام و نشان ہمارا صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا معلوم کیا کسی کو دردِ نساں ہمارا	سارے جہاں سے اچھا بند و ستاں ہمارا غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہوں وطن میں پرہیز و سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا گودی میں کیسلی تھی اُسکی ہزار وندیاں اے آبِ رود گنگا وہ دن ہے یادِ تجھ کو نہ بے نہیں سکھاتا آپس میں بیرکھنا یونان مصر و ماس سب مٹ گئے جہاں کچھ بات ہے کہ ہستی مٹی نہیں ہماری اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں

جگنو

یا شیخ مل رہی ہے پھولوں کی آہن میں
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
غربت میں آکے چکا گناہ تھاؤں میں
ذرہ ہے یا نایاں سورج کے پیر میں
لے آئی جس کو قدرت خلوت و انجمن میں
تکلا کبھی گن سے آیا کبھی گن میں

جگنو کی روشنی ہے کاشانہ چمن میں
آیا ہے آسمان سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
تکم کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
حسن قدیم کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی
چھوٹے سے چاند میں ظلمت بھی روشنی بھی

پروانہ اک پتنگا جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا جویا یہ روشنی سراپا

پروانے کو تیش دی جگنو کو روشنی دی
گل کو زبان دے کر تسلیم خاموشی دی
چمکا کے اس پری کو بھٹوڑی سی زندگی دی
پہنا کے لال جوڑا شبنم کو آرسی دی
پانی کو دی روانی موجوں کو بیکلی دی
انساں کو آگئی کیا ظلمت کو چاندنی دی

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دبری دی
رنگیں نوا بنایا مرغان بے نوا کو
نظارہ شفق کی خوبی زوال میں تھی
رنگیں کیا سحر کو بانگی دھن کی صورت
سایہ دیا شجر کو پرواز دی ہوا کو
اک مشت گل میں رکھا احساس کا شزارہ

یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری

حُسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا انداز گفتگو نے دھوکے دئے ہیں ورنہ کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی	انساں میں وہ سخن ہو غنچے میں وہ چٹک سے واں چاندنی ہے جو کچھ یاں در در کی گیت نغمہ ہے بوسے بیل، بوبھول کی پہک سے جگنو میں جو چمک ہے وہ بھول میں ہمک سے
یہ اختلاط پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو ہر شے میں جب کہ پنہاں خاموشی لڑی	
نیا شوالہ	
سچ کہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانتے اپنوں سے پیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا کچھ فکر بھوٹ کی کڑ مالی ہے تو چمن کا	تیرے صنم کہ دوں کے بُت ہو گئے پرانے جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے واعظ کا وعظ چھوڑا۔ چھوڑے ترسے سننے بولوں کو بھونکٹ الا اس بس بھری ہوئے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے خاکِ وطن کا ٹھکرو ہر ذرہ دیوتا ہے	
آرمل کے غیریت کے پر دوں کو بچھڑا ڈھال سوئی پڑی ہوئی ہے مدتِ سوچی کی بستی دنیا کے تیر تھوں سے اونچا ہوا پنا تیر تھ	بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی ملا دیں آکِ نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں دِمانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

اس ہر دو آردل میں لاکر جسے بٹھالیں
 اس دیوتا سے مانگیں جو دل کی ہو مڑیں
 یعنی صنم کدے میں شانِ حرم دکھا دیں
 ہر آنکھ کو گویا اک آگ سی لگا دیں
 اس دیوتا کے آگے اک ہنر سی بہا دیں
 بھولے ہوئے ترانے دُنیا کو بھر سنا دیں
 سارے بجا ریوں کو مے پیت کی پلا دیں
 آواز دُ ازاں کو ناقوس میں چھپا دیں
 دھرموں کے یہ بکھیرے اس آگ سے جلادیں

پھر اک انوپ ایسی سونے کی مورتی ہو
 سندر ہو اس کی صورت چھب اسکی موہنی ہو
 زنار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو
 پہلو کو چیر ڈالیں درشن ہو عام اس کا
 آنکھوں کی ہے جو گنگا لے لے کے اسے پا
 ”بندوستان“ لکھ دیں ہاتھ پر اس صنم کے
 ہر صبح اٹھ کے کائیں منتر وہ بیٹھے بیٹھے
 مندر میں ہو بلانا جس دم بجا ریوں کو
 آگنی ہے وہ جو زنگن کہتے ہیں بیت جس کو

ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا
 رو ناستم اٹھانا اور ان کو پیار کرنا

ہندت برنج نرین چکبست

غزلوں کا انتخاب

دل کئے تسخیرِ خشتِ فیضِ روحانی مجھے کلفتِ دنیا مٹے بھی تو سخی کے فیض سے خود پرستی مٹ گئی قدرِ محبت بڑھ گئی وزرہِ وزرہ ہے مرے کشمیر کا سماں نواز	حُبِ قومی ہو گیا نقشِ سلیمانی مجھے ہاتھ دھونے کو ملے بہتا ہوا پانی مجھے ماتم احباب ہے تعلیمِ روحانی مجھے راہ میں پیچھے کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

فنا کا ہوشِ آما زندگی کا دردِ سرِ جانا غریزانِ وطن کو غمِ بزرگ و شمر جانا مصیبت میں بشر کے جو ہر مردِ اگھلے ہیں اجل کی نیند میں بھی خوابِ سستی گز نظر آیا وہ سودا زندگی کا ہے کہ غمِ انسان سہتا چمن زارِ محبت میں اُسی نے باغبانی کی وہ طبعِ یاس پرور نے مجھے شہیمِ عقیدت دی	اجل کیا ہے خمارِ بادۂ سستی اُتر جانا خدا کو باغیاں اور قوم کو ہم نے شجر جانا مبارک بُردلوں کو گردشِ قسمتِ طور جانا تو پھر بیکار ہے تنگ کے اس ٹنیے مر جانا نہیں تو ہے بہت آسان اس جینے و مر جانا کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا کہ شامِ غم کی تاریکی کو بھی نورِ سحر جانا

آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا
پھول کا خاک کے تودہ سے نمایاں ہونا
ہے اسے طرہ دستار غسریاں ہونا

درد و دل پاس و فاجدہ ایساں ہونا
زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
دفعہ حسن پر مہر قدرت سمجھو
گل کو پامال نہ کر غسل و گہر کے مالک

سلامت میری گردن پر رہے بارالم میرا
یہ وہ بندہ جو جس پر ناز کرتا ہے کرم میرا
وجہ دکل جسے سمجھے ہیں سب ہے وہ عدم میرا
یہی جنت ہے میری اور یہی باغ ارم میرا
دُشوار ہے اشکِ فانی میں چشمِ غم میرا
اسی پر ختم ہے افسانہ درد و الم میرا
مثلاً اگر روشِ افلاک نے جاہ و حشم میرا
کہ دشمن ہے برہمن اور عدو شیخِ حرم میرا

نہ کوئی دوست دشمن ہو شریکِ دردِ غم میرا
لکھائیہ داد و بخشش میری فرد و عصیاں پر
کما غنچہ نے منہس کر دواہ کیا نیرنگ عالم ہے
دلِ احباب میں گھر ہے شگفتہ رہتی ہے خاطر
متاعِ درد و دل اک دولتِ بیدار ہی ہم کو
رہی ہے ایک ترکِ آرزو کی آرزو باقی
زبانِ حال سے یہ لکھنؤ کی خاک کہتی ہے
کیا ہے فاش پر وہ کفر و دیل اس قدر میں

رامائن کا ایک سین

(راجہ رام چندر ہی کا ماں سے نصحت ہونا)

راہ و فاکِ منزلِ اول ہوئی تم سام

رفعت ہو اوہ باپ سے لے کر خدا کا نام

دامن سے اشک پوچھ کے دل سے کیا کلام	منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام
	آخر بے کچھ خدِ ستم و ظہلم و جور بھی ہم کو اُداس دیکھ کے غم ہو گا اور بھی
خاموشی ماں کے پاس گیا صورت خیال سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدتِ ملال	دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ خوش نصال دیکھا تو ایک درمیں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
	تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے اگویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے
نورِ نظر پر دیدہ حسرت سے کی نگاہ لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ	کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بگینا جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ
	چہرہ کا رنگِ حالتِ دل کھولنے لگا ہر مونے تن زباں کی طرح بولنے لگا
افسانہ شد اُندرِ رنج و محن کھلا وا تھا دہانِ زخم کہ بابِ سخن کھلا	آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھلا اک دفترِ مظالم چرخِ گمن کھلا
	درِ دلِ غریب جو صرف ہیاں ہوا خونِ جگر کا رنگِ سخن سے عیاں ہوا
میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم ہیاں لیکن میں اپنے مُنہ سے نہ ہرگز کہوں گی کہاں	رو کر کما نموش کھڑے کیوں ہو میری جا سب کی خوشی یہی ہے تو صحر کو بورِ واں

	کس طرح بن میں آنکھوں کے تاریک کو بھیج دوں جوگی بن کے راج دُلا رہے کو بھیج دوں	
دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا اُلو سپید انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھسید	اندھاکئے ہوئے بے زر و مال کی اسید سوچے بفر تو جسم ہولناک مثال بید	
	لکھی ہے کیا حیاتِ ابدِ اُلو کے واسطے پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کو واسطے	
یہی کسی فیکر کے گھر میں اگر جسم ڈستانہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم	ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت کم	
	میں خوش ہوں بھونکے کوئی اس سخت و مانع کو تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں گی راج کو	
کن کن ریاضتوں گزارے ہیں ماہ و سال لائے دو لہجہ بیاہ کے شادی ہوئی کمال	دیکھی تمہاری شکل جب اے میرے نونال آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال	
	چھٹی ہوں اُن سے جوگ لیا جن کے واسطے کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کے واسطے	
ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر رہتا مابھی نخل تمتا جو بے ثمر	گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر یہ جائے صبر تھی کہ دعائیں نہیں اثر	
لے بھرت جی کی ہانک لکھی کے طعن اشارہ ہے غلی صحت جو کہ راجد شتر نے رنجیدہ جی کہیں پاس کلام دیا تھا اور بھرت جی کو اپنا دلیو بھر دیا تھا		

	لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا پھل پھول لاکے باغ تمنا آجڑ گیا	
منجھدار میں جویوں مری کشتی ہوئی تباہ اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ		سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ
	تقصیر میری خالق عالم بھل کرے آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے	
اُس خستہ جاں کے دل پہ چلی عم کی تخت تیز لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز		سُن کر زباں سے ماں کی یہ فریاد درد خیز عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں بولیں شکِ زیز
	سو چاہی کہ جان سے بے کس گزندہ جائے ناشادہ ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے	
مالوس کیوں ہیں آپلم کا بے کیوں فور لیکن نہ دل سے کیجئے صبر و قرار دور		پھر عمن کی یہ مادر ناشاد کے حضور صدہ یہ شاق عالم پیری میں ہے مزدور
	شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی	
ہونا مجھے سب اُس کے بہانے ہیں سرسبز کیا جانے کیا ہے پردہ قدرت میں جلوہ		یہ جعل یہ فریب یہ سازش یہ شور و شر اسباب ظاہری ہیں نہ ان پر کردِ نظر

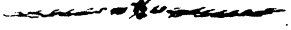
خاص اُس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں منظور کیا اُسے ہے کوئی جانتا نہیں	
راحت ہو یا کہ رنج خوشی ہو کہ انتشار تم ہی نہیں ہو کشتہ نیرنگ روزگار	واجب ہر ایک رنگ میں شکر کردگار ما تم کہہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار
سختی سہی نہیں کہ اٹھائی کڑی نہیں دُنیا میں کیا کسی پر مصیبت پڑی نہیں	
دیکھیں ہیں اس بڑھ کر زمانے نے انقلاب سوزِ دروں سے قلب جگر ہو گئے کباب	جن سے کہ بیگنا ہوں کی عمریں ہوئیں خزا پیری مٹی کسی کی کسی کا مٹا شباب
کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے وہ بجلیاں گویں کہ بھرے گھڑا جڑ گئے	
ماں باپ منہ ہی دیکھتے تھے جن کا ہر گھڑی دامن پہ جن کے گرد بھی اڑ کر نہیں پڑی	قائم تھیں جن کے دم سوسائیدیں بڑی بڑی ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھری
محرّم جب وہ نکل ہوئے رنگِ حیات سے اُن کو جلا کے خاک کیا اپنے ہات سے	
کتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال ہے کبریا کی شان گزرتے ہی ماہ و سال	ان بکیوں کی جان کا بچنا ہے اب محال خود دل سے در و ہجر کا ٹٹا گیا خیال

	ہاں کچھ دنوں تو نوحہ و ماتم ہوا کیا آخر کورو کے پیٹھ رہے اور کیا کیا	
اُکرتا ہے اُس کو مبر عطا آپ کر دو گار یہ جانتے نہیں وہ ہے دانائے روزگار		پڑتا ہے جس غریب پر رنج و محن کا بار مالیوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گناہگار
	انسان اُس کی راہ میں ثابت قدم رہتا گردن وہی ہے امر و ضامیں جو خم رہے	
بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام قائم امید ہی سے ہو دنیا ہو جس کا نام		اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس کا
	اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں کیا ہو گا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں	
ہو دن کی دھوپ رات کی شب بزمِ انھیں گراں وہ گل ہزار پردوں میں چلتے ہیں لایاں		اکثر ریاض کرتے ہیں بچوں پر باغبان لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگماں
	رکھتے ہیں جو عزیز انھیں اپنی جاں کی طرح ملتے ہیں دستِ یاس وہ برگِ خزاں کی طرح	
موقوف کچھ ریاض یہ ان کی نہیں سہار وہ اُبر و باد و برف میں تہتے ہیں تقرار		لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بے شمار دیکھو یہ قدرتِ چمن آراے روزگار

	ہوتا ہے اُن پر فضل جو رب کریم کا موجِ سمومِ ہنتی ہے جھونکا نسیم کا	
اپنی نگاہ ہے کرم کار ساز پر جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو محضر	صحرا چمن بنے گا وہ بے مہربان اگر رہتا نہیں وہ حالِ سربند کے بے خبر	
	اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں دامانِ دشتِ دامنِ مادر سے کم نہیں	
دولت		
کہتے تھے بُرا زکوٰۃ کو سخنِ پنج پُر ا نے وہ فلسفہ و علم و ادب اب ہیں فسانے	اُن لوگوں کے ہمراہ گئے اُن کے زمانے بدلا ہے نیا رنگِ زمانے کی ہوائ نے	
	دولت سے ہوا ب زینتِ کاشاءِ تہذیب کہتے ہیں اسے شمعِ جلو خانہِ تہذیب	
مٹ جانے پہ بھی نام و نشان رہتا ہے اس سے تازہ چمنِ تاب و تولاں رہتا ہے اس سے	سرِ حقیقہ امید رواں رہتا ہے اس سے پیری میں بھی انسانِ جوان رہتا ہے اس سے	
	ہر رنگ میں یہ تازگیِ قلب و جگر ہے ہے صلح میں شمشیرِ لڑائی میں سپر ہے	
کوششِ کبھی زردار کی جاتی نہیں بے سود	رہتا ہے سدا سا یہ فگنِ طلعِ مسود	

انسان کی نیت میں اگر شر نہ ہو موجود	زر ہاتھ میں اس کے ہر کلید در مقصود
کب گو ہامید کورولا نہیں اس نے	کتھا کونسا در بند جو کھولا نہیں اس نے
ہوں طالب تحقیق کہ دل دادہ تعلیم	نہ سستے ہیں انھیں کے لئے ہر کوشش و تسنیم
دنیا ہی میں کچھ ذکر نہیں تازہ ہوا اس کا	در بار میں اللہ کے آواز ہے اس کا
لیکن وہ زرو مال نہیں قابل تحسین	انساں کو بنا دے جو شکم پر در و خو ہیں
زردار وہ ہے جس میں شرافت کی آئیں	ہو بزم محبت کے لئے باعثِ تزئین
سر سبز ہے قوم یہ انعام ہو اس کا	باراں کی طرح فیض و کرم عام ہو اس کا
مانا ہو بس زر ہے بشر کے لئے عادت	لیکن نہیں دنیا میں فقط اک ہی نعمت
کچھ اور بھی جو سر ہیں عطا کردہ قدرت	غجواری و دلجوئی و ہمدردی و الفت
زر آپ نہیں دشمن اخلاق و ادب ہے	جو حد سے گذر جاتی ہے وہ اس کی طلب ہے
جو لوگ جو حرص سے دنیا میں ہیں شہل	جینے کی لطافت سے نہیں اُن کو سروکار
مانند گزار کے ہیں ہر وقت طلبگار	آزاد کہاں دام طبع میں ہیں گرفتار

	محرورمئے عیش سے یہ خستہ جگر میں مالک نہیں زر کے ہیں فقط بندہ زریں	
اکیر ہو درد دل بے کس کی دوا ہو خامات فلاکت کے لئے آبِ بقا ہو		دولت وہ ہے مجبور کی جو عقدہ کشا ہو آئینہ اخلاق و محبت کی جہلا ہو
	یوں فیض کے چشمے ہوں روانِ باغِ جن جیسے کرم ابگر سر بارِ حین .. میں	
لبیل گلِ نگیس سے یہ کرتی ہے حکایت الگشتی کبھی دیکھی نہیں فیاض کی دولت		ہر صُبح گلستاں میں بعدِ شانِ فصاحت دیکھو چن آراے دو عالم کی عنایت
	گو کم در خوش آب لٹانا نہیں ہوتا خالی کبھی شبنم کا خزانہ نہیں ہوتا	
پر مغلس بے کس بھی نہیں قابلِ نفرت بس نشہِ زور سے نہ تھکے چشمِ مروت		مانا سببِ شوکت و اجلال ہے دولت ادنیٰ سے ملے تھکے یہ اعلیٰ کی عظمت
	ہے کبر اے شانِ امارت نہیں کہتے کچھ کہتے اسے حُسنِ شرافت نہیں کہتے	
دل تیرگی کبر سے کوسوں ہی مگر دور دیتا ہے اسے جامِ سی اپنے وہیے نور		کس اونچ پہ خورشید جہاں تاب ہو معمور گو خاک نہیں ذرۂ ناچیز کا مقصد و ر
	ایامہ کا اس اونچ پہ کیا فیض عیاں ہے	

	ہر خانہ مفلس کے لئے شمع مکاں ہے	
کیا کیا اسے ہوتے نہیں اعزاز میسر دستار میں نوشہ کی رہا کرتا ہے اکثر	یا باغ میں کھلتا ہر دم صبح گل تر بنتا ہے عروسان جہاں کے لئے زیور	
	لیکن نہ کسی وضع پر اس ڈھنگ سے دیکھا بیکس کی لحد پر اسے جس رنگ سے دیکھا	
 مکتب خانہ سلیم جہانہ عثمانیہ 		

